دہلی کالج، انگریزی تعلیم اور کشادہ ذہنی کی تشکیل

(۱۸۲۴ء۔۱۸۵۷ء)

پروفیسر مظہر مہدی☆
Professor Mazhar Mahdi

تلخیص:

۱۷۹۲ میں قائم شدہ روایتی تعلیم کے ادارے مدرسہ غازی الدین کو انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی تعلیم کے اجرا کے لیے منتخب کیا گیا۔ دہلی گورنمنٹ کالج کے نئے نام سے موسوم اس ادارے میں دی جانے والی انگریزی تعلیم کو مشرقی تہذیب و اقدار کے حق میں ضرر رساں تصور کیا گیا۔ اس لیے ۱۸۵۷ کی سامراج مخالف عظیم بغاوت کے دوران میں، جدید تعلیم کے مخالفین نے اس ادارے کو تباہ و برباد کر دیا اور اس کے انگریز پرنسپل کو قتل کر دیا۔ اس مضمون کی تسوید کے عمل میں چند سوالات پیش نظر رہے ہیں: کیا انگریزی تعلیم طلبا کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے وہی کردار ادا کر رہی تھی جس کا تصور ابتدا میں اس کے محرکین اور پالیسی سازوں نے پیش کیا تھا؟ کیا حقیقت میں یہ ادارہ، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، جدید اقدار اور تہذیب کی ایک اہم ایجنسی تھا؟ کالج کے نصاب تعلیم میں شامل مضامین اور طلبا پر انگریزی تعلیم کے اثرات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے فارغ التحصیل طلبا کی معاشرتی زندگی کیسی تھی اور وہ کس قسم کے پیشے سے منسلک ہوئے؟

ان سوالات کے مد نظر اس مضمون میں انگریزی تعلیم کے پالیسی سازوں کے نظری مباحث کے محاکمہ کے ساتھ دہلی کالج کے قیام اور اس کے نشیب و فراز کی مختصر روداد بیان کی گئی ہے۔ نیز کالج کے جدید نصاب میں شامل مضامین، وہاں کی انگریزی تعلیم اور تعقلی فضا سے طلبا پر مرتب ہونے والے عقلیتی اثرات کو روشن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ طلبا نے کالج سے فراغت کے

☆ اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷
ای میل: mazharmehdi@gmail.com

بعد جس قسم کے پیشے کو اختیار کیا اور جس قسم کی معاشرتی زندگی انھوں نے گزاری اس کو بھی یہاں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد انگریزی تعلیم کے ان اقدار اور کردار کی تفہیم ہے جس کا فروغ نو آبادیاتی برطانوی حکومت کا اصل منشا تھا۔

ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اجرا

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسوں صدی کے اوائل میں برطانیہ میں موجود اور ہندوستان میں مقیم برطانوی حکام نے آپس میں اس امر پر پرزور مباحثہ کیا کہ ان کی سلطنت کے ماتحت عوام کو کس قسم کی تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ عوام الناس کے لیے درکار تعلیم اور تعمیر حکومت کے لیے اس کی موزونیت اس مباحثے کا مرکزی نقطہ تھا۔ مباحثہ میں شامل حکام کی رایوں میں اس پیچیدہ معاملے میں اختلاف پڑ گیا۔ ان کے اس نظری اختلاف کو وسیع تر مستشرق (Orientalist) اور انگلیسیتی (Anglicist) کے دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ تعلیمی صورت حال میں تغیّر و تبدل کے اجرا کے لیے برطانیہ میں انگلیسیتوں (Anglicists) کا ابتدائی استدلال اور عوام الناس کی کثیر آبادی کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے مشنریوں کی طرف سے آئندہ ادا کیے جانے والے کردار کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ اس ملک میں چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے عوام غیر تعلیم یافتہ اور اوہام پرست ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ انواع انواع کی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ اس صورت حال نے چارلس گرانٹ (Charles Grant 1746-1823) کو روایت پسندی، مذہبی قدامت پسندی اور دیگر سماجی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ماقبل سرمایہ دارانہ ذرائع پیداوار پر علوم طبعی اور میکانیات کے نظری علم کا نسخہ آزمانے اور زراعتی مشینری کے استعمال پر آمادہ کیا۔ انگریزی کو انتظامیہ، عدلیہ اور محکمہ محصولات کی زبان اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کے خیال کی وکالت بھی اسی نسخے کا ایک حصہ تھی۔ سرکاری منشا سے پرے اگر اس نسخے کی متوقع اثر پذیری پر غور کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کی زبانوں، تہذیبوں اور انتظامیہ پر اس کے دوررس نتائج مرتب ہونے والے تھے۔ علاوہ ازیں اس تجویز میں عیسائیت کی تعلیمات کو بھی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا مقصد ملک کے مذہب کی فلسفیانہ اساس، مذہبی ضابطۂ اخلاق اور مروجہ ضابطۂ عمل میں بنیادی تغیر تھا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں مغربی ''روشنی اور علم'' یا انگریزی تعلیم کے اجرا کا خیال اس ملک کی روایتی تہذیب میں تبدل اور عوام الناس کی وہم پرست ذہنیت میں انقلاب برپا کرنے کا ایک ابتدائی خاکہ تھا۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی زمانہ میں بنارس میں برطانوی حکومت کے نمائندہ (Resident) جو نتھن ڈنکن (Jonathan Duncan ۱۷۵۶ء۔۱۸۱۱ء) نے ہندو مذہب، فلسفہ، قوانین اور علوم وفنون کو گورنمنٹ سنسکرت کالج میں پڑھانے کی وکالت کی۔ اس کالج کا قیام ۱۷۹۱ء میں عمل میں آیا۔[۲] اس بات کی وکالت و تائید میں وہ نہ صرف ہندوستان کے پہلے گورنر وارن ہیسٹنگس (Warren Hastings ۱۷۳۱ء۔۱۸۱۸ء) کے تیار کیے ہوئے مشرقی علوم سے متعلق برطانوی پالیسی یعنی نظریۂ استشراق (Orientalism) کی پیروی کر رہا تھا بلکہ نو آبادیاتی سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر بنارس کو ہندو عقیدے کے مرکز کی حیثیت سے بھی دیکھ رہا تھا اور روایتی طور پر ممتاز طبقے (elite) یعنی برہمنوں کو ان علوم وفنون کی نشر و اشاعت کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ بہر حال روایتی اسلامی تعلیم کے ایک ادارے مدرسہ غازی الدین کی بنیاد دہلی میں ۱۷۹۲ء میں رکھی گئی۔

ہندوستان میں مقیم برطانوی حکام میں بھی یہ احساس پروان چڑھ رہا تھا کہ عوام الناس کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے خیالات جداگانہ تھے۔ لارڈ منٹو(Lord Minto ۱۷۵۱ء۔۱۸۱۴ء) اور لارڈ موئرا(Lord Moira ۱۷۵۴ء۔۱۸۲۶ء) نے بھی اپنے اپنے دوران حکومت میں اس قضیہ کو اٹھایا جیسا کہ یہ علی الترتیب ۱۸۱۱ء[۳] اور ۱۸۱۸ء کی ان کی روداودں میں مذکور ہے۔[۴] موئرا نے اس بات پر زور دیا کہ صرف اسکولوں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا جائے بلکہ جنرل سائنس سے متعلق درست افکار اور علم الاخلاق سے متعلق صحیح اصولوں کی تعلیم دی جائے۔[۵] بہر حال ایسٹ انڈیا کمپنی اس تعلیم کے سلسلے میں اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھی کیوں کہ اس وقت تک انگلینڈ میں تعلیم کو حکومت کی ذمہ داریوں میں شمار نہیں کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں تعلیم کی نشرواشاعت ہر شخص کی دلچسپی کا موضوع بنا رہا اور اس پر تقریباً دو دہوں تک زور و شور سے بحث و مباحثہ ہوتا رہا جو اس وقت ذرا ٹھہر گیا جب ۱۸۱۳ میں چارٹر ایکٹ میں تجدید کا معاملہ پیش ہوا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیم کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر چارٹر میں شامل کر لیا۔

وکلائے رعایا کی کچہری (House of Commons) میں اس موضوع پر بحث و مباحثے کے دوران میں ولبر فورس[۶] (Wilberforce) نے جو چارلس گرانٹ کا دوست اور ہم مشرب تھا، ہندوستانی قلم رو کے عوام کو تعلیم یافتہ بنانے اور ان کے اندر بیداری لانے کی شدید ضرورت محسوس کی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ تعلیم و تعلم سے، علم کی نشر و اشاعت سے، سائنس کے فروغ سے،

بالخصوص ان سب کے ساتھ ملکی زبانوں میں مقدس صحیفوں کی اشاعت سے ایسے نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں جن کی توقع مشنریوں کی راست محنت سے بھی نہیں کی جا سکتی۔(۷)

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ سائنسی تعلیم ایک ایسا معاملہ تھا جس پر تقریباً تمام مشنریوں نے حد سے زیادہ توجہ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ لوگوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ توہم پرستانہ طور طریقوں کو چھوڑ دیں گے اور برطانوی حکومت کے مداح ہو جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دیگر امور کے علاوہ عیسائیت کو قبول کرنے طرف مائل ہو جائیں گے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس نوع کی تعلیم میں ضرور اخلاقی اور سماجی بندشوں سے آزادی دلانے کی امکانی صلاحیتیں اور کچھ مثبت نتائج پیدا کرنے کی قوتیں موجود تھیں۔(۸)لیکن وہ لوگ جس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام رہے جو ایک بڑا سچ ہے وہ یہ کہ ایک سچے عقلیت پسند ذہن رکھنے والے انسان کے نزدیک تمام مذہبی عقائد توہم پرستی پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ کہ ان کے ذہنوں میں مشرقی اور مغربی مذاہب کے درمیان کوئی فرق یا امتیاز نہیں ہوتا۔

جو تحریک گرانٹ اور ولبر فورس نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے اجرا کے لیے تقریباً دو دہوں تک چلائی تھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی جس کے نتیجے میں ۱۸۱۳ء کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایکٹ میں ۴۳نمبر کے شق کو شامل کیا گیا۔ اس کے مطابق گورنر جنرل بہ اجلاس کو ''ادب کے احیا اور فروغ''، ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی حوصلہ افزائی اور اس ملک کے باشندگان کے درمیان سائنسی علم کے اجرا اور فروغ کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم خرچ کرنے کی اجازت دی گئی۔(۹)

اس ایکٹ کی شق نمبر ۴۳ مشہور ہو سکتی ہے کیوں کہ اس میں پہلی بار قانونی طور پر ہندستان میں تعلیم کے حقوق کو تسلیم کیا گیا۔(۱۰) ڈائرکٹروں کی کچہری (Court of Directors) کی طرف سے اگلے سال گورنر جنرل بہ اجلاس کو جو پہلا تعلیمی مراسلہ (dispatch) روانہ کیا گیا وہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں متعدد قسم کے شکوک و شبہات منعکس ہو رہے تھے اور یہ جدید سائنسی علوم کی نشر و اشاعت کی غیر مشروط تائید سے عاری تھا۔(۱۱) ایک طور پر اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کس قسم کی تعلیمی پالیسی اختیار کرے گی۔ اس معاملے میں جو امر اہمیت کا حامل ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۱۴ کا مراسلہ ڈائرکٹروں کی کچہری کی جانب سے جاری کیا گیا تھا جس سے ہندستان میں تعلیم کے باب میں اصلاح پسند موقف کی تائید نہیں ہوتی تھی۔

کمپنی کے عہدیداران اس قدیم پالیسی میں کسی قسم کے تغیر کے حق میں نہیں تھے جس پر وارن ہیسٹنگس کے زمانے سے عمل درآمد ہو رہا تھا۔ اور جس نے ۱۷۸۱ میں کلکتہ مدرسہ قائم کیا تھا۔ بہر حال ان کی دلیل یہ تھی کہ ہندستان کے عوام یوروپی ادب اور سائنس کی قدر و قیمت سے بہت کم واقف تھے۔ اس کے علاوہ انھیں تربیت یافتہ اساتذہ اور درکار کتابوں کی غیر موجودگی کی صورت میں اس پالیسی کی کامیابی پر بھی شک تھا۔ ٹومس منرو(Thomas Munro) نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ہندوستان میں تعلیم کی جملہ صورت حال فی الحال خراب ہو سکتی ہے لیکن یہ بہت پرانی بات نہیں ہے کہ یہاں کی تعلیم کا معیار یوروپ کے اکثر ممالک سے یقیناً اعلیٰ اور بہتر تھا۔[۱۲] عوام الناس کے لیے تعلیم کو دو وجوہ سے ناقابل عمل خیال کیا جارہا تھا۔ اول، اگر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا تو یہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگا۔ دوم، اگر دیسی زبانوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو" ۱۸۱۳ کے ایکٹ کے تحت تعلیمی مقاصد کے لیے جو قلیل فنڈ مختص کیا گیا ہے"[۱۳] وہ بہت کم پڑ جائے گا اور خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ موجودہ صورت حال میں ڈائرکٹروں کی کچہری نے 'بڑے شہروں میں اعلیٰ اور "متوسط" طبقوں کے لیے لبرل تعلیم' کی حمایت کی جس سے وہ دو مقاصد کے اصول کی توقع کر رہے تھے۔ اول، انھیں سرکاری کاروبار چلانے کے لیے سستے عملے مل جانے کی امید تھی۔ اور دوم اس سے ایسے لوگوں کی ذہن سازی بھی ہو سکے گی جن کا اپنی قوم میں بہت دور تک اثر و رسوخ ہے۔[۱۴] اس رویہ کو تسلیم کرانے میں کامیابی ملی اور تقریباً ایک دہے کے پس و پیش کے بعد حکومت اس پر آمادہ ہو گئی۔[۱۵] نئے چارٹر کی تعمیل میں گورنر جنرل بہ اجلاس کے ایک قرارداد کے ذریعے سے ۱۸۲۳ میں تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی کی تشکیل دی گئی۔ یہ عوامی تعلیمی نظام کے نئے دور کا آغاز تھا۔[۱۶]

ولیم بینٹنک (Lord William Cavendish Bentinck ۱۷۷۴ء۔۱۸۳۸ء)

4جولائی ۱۸۲۸ء کو گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے ایک سال کے اندر ہی انھوں نے اپنی ایک سرکاری یادداشت (minute) میں یہ اعلان کیا کہ ہندستان میں انگریزی علوم و فنون کا اجرا اس ملک کے لیے از حد فائدہ مند ہوگا۔[۱۷] بروس میکولی کا بیان ہے کہ 'بینٹنک کے ساتھ ایک نئے عہد کا آغاز ہوا یعنی کہ مشرقی علوم کے لیے یوروپی خیالات اور علوم کی اتباع اور ہندستانی رسم و رواج میں شدید اصلاح کے دور کا آغاز۔ ۳۰/ مئی ۱۸۲۹ء کو جاری کردہ بینٹنک کی سرکاری یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے تعلیمی امور میں کس قدر دلچسپی تھی۔ انھوں نے

کلکتہ شہر میں واقع ہندو کالج کا بار بار دورہ کیا جو کلکتہ کے ہندوؤں میں یوروپی بیداری پھیلانے کے تعلق سے ان کا ایک قابل فخر کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔[۱۸]

چارلس ٹریولین (Charles E. Trevelyen ۱۸۰۷ء۔ ۱۸۸۶ء) جو ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء دہلی میں معاون ریزیڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے اور ۱۸۳۳ء تا ۱۸۳۸ء تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی کے رکن تھے ان کی حکومت سازی کے بڑے منصوبے کا ایک حصہ انگریزی تعلیم تھی جس کا مقصد ہندستان میں انگریزی زبان، یوروپی علوم اور آخرش عیسائی عقیدے کا قیام تھا۔ اپنی سامراجیت پسندی کے جوش میں وہ اس ملک کو ایشیا کے دیگر ممالک تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔[۱۹] انگلیسیتی رویے کے پرزور حامی ٹریولین نے بنٹنک کو لکھا:

> ”اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا کہ ہندستان میں ایک عظیم اخلاقی تبدیلی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ملک کے ہر گوشے میں اس بات کے اشارات نظر آرہے ہیں۔ ہر جگہ اسی نظام کہنہ کا قطعی استرداد قابل مشاہدہ ہے، ہر جگہ تعلیم و تربیت کے ایک بہتر نظام کی آرزو کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ خصوصی مراعات جو فارسی زبان کو عدالتوں اور عدالتی امور میں حاصل ہے ان کی منسوخی ایسی زبردست اچوک حکمت ہو گی جس سے ہندومت اور اسلام کی بنیادیں ہل جائیں گی۔“[۲۰]

بینٹنک کو بھی جنرل کمیٹی کے ان انگلیسیتی اراکین کے ساتھ ہمدردی تھی جو مشرقی علوم کی سرپرستی کے رواج کے شدید مخالف تھے اور عربی، فارسی اور سنسکرت کے طلبا کے لیے مخصوص وظائف اور ان زبانوں میں طبع ہونے والی کتابوں کے لیے مختص مالی امداد میں تخفیف کے حامی تھے۔[۲۱] انگریزی اور ذریعہ تعلیم کے باب میں انگلیسیتوں کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے میکالے نے ۲رفروری ۱۸۳۸ء کو اپنی مشہور سرکاری یاداشت جاری کی[۲۲] جس کے فوراً بعد بینٹنک نے ۷رمارچ ۱۸۳۸ء کو ایک قرارداد پاس کیا جس میں ہندستانی باشندوں کے درمیان یوروپی ادب و سائنس کے فروغ کو برطانوی حکومت کا عظیم مقصد قرار دیا گیا اور اس امر پر زور دیا گیا کہ تمام رقوم جو تعلیم کے مقصد کے لیے مختص ہیں ان کا صرف انگریزی تعلیم پر استعمال ہونا چاہیے۔ اس قرارداد میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی کہ ہندستان کے تعلیمی اداروں کو منسوخ کرنے کا حکومت کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ اس کمیٹی کی نگرانی میں چلنے والے تمام اداروں کے پروفیسران اور طلبا کو ان کے وظائف ملتے رہیں گے۔ البتہ، اگر کوئی طالب علم اس کے بعد ان میں کسی ادارے میں

داخل ہوتا ہے تو اس کو کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ جب مشرقی علوم کا کوئی پروفیسر اپنا منصب چھوڑ دے گا تو حکومت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اس عہدے پر کسی کا تقرر کرے یا نہ کرے۔ اس میں اس بات کی بھی ہدایت تھی کہ فنڈ کا کوئی بھی حصہ اس کے بعد سے مشرقی علوم کی کتابوں کی طباعت پر خرچ نہیں کیا جائے گا اور ان اصلاحات کی وجہ سے صرف نہ ہونے والے مالی وسائل کا انگریزی ادب و سائنس کے علم کی تدریس پر استعمال کیا جائے گا اور انگریزی زبان اس تدریس کا ذریعہ ہوگی۔(۲۳) اس سرکاری فرمان کے ذریعے سے بینٹنک نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ انگریزی تعلیم کا سب سے بڑا حامی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نو آبادیاتی ہندستان میں تعلیمی پالیسی پر اس فرمان کو سب سے زیادہ موثر دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس فرمان نے روایتی تعلیم کی جڑوں کو اپنے طور پر تقریباً اکھاڑ پھینکا۔ اس سے تعلیم کے میدان میں انگلیسیتی رجحان کو زبردست فروغ ہوا۔

دہلی میں کالج برائے انگریزی تعلیم کا قیام

ستمبر ۱۸۲۳ میں تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی نے مقامی ایجنٹوں کو ایک گشتی مراسلہ ارسال کیا جس میں ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ ہندوستان میں تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے اور وقتاً فوقتاً ان اقدام سے متعلق سفارشات بھیجی جائیں جن پر عمل درآمد کرنا تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے، مفید مطلب علوم و فنون کو متعارف کرانے اور عوام الناس کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لیے ضروری نظر آتا ہو۔ ساتھ ہی اس کمیٹی نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ مقامی ایجنٹ حضرات اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ کیا کوئی ایسا فنڈ ہے جو عوامی نوعیت کا ہو اور جس کا استعمال تعلیم عامہ کی نشر و اشاعت پر کیا جائے۔(۲۴) اس خط کے جواب میں مقامی ایجنسی کے سکریٹری جان ایچ۔ ٹیلر (John H. Taylor) نے دہلی میں تعلیمی صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے حکومت کی اس تجویز کو گراں قدر سمجھا اور اسے شہر دہلی کے تباہ حال اشراف کے لیے بالخصوص ایک بہترین موقع سمجھا(۲۵) کیونکہ یہ تعلیم ہی تھی جسے حاصل کر کے وہ اپنی قسمت سنوار سکتے تھے اور باوقار زندگی گزار سکتے تھے۔ خوش آئند توقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے نہ صرف دہلی میں کالج کے قیام کو منظوری دی گئی بلکہ اس کے فوری قیام کی سفارش بھی کی گئی۔ ٹیلر نے مقامی ایجنٹوں کے مشورے کو حکام تک پہونچاتے ہوئے کہا کہ کشمیری مسجد میں جو مدرسہ ایجنسی کے ماتحت ہے اس مقصد کی تکمیل کے لیے مناسب ترین عمارت ہو سکتی ہے۔ اس میں بر آمدے کے ساتھ ۸۴/اپارٹمنٹ ہیں جو طلبہ اور

اساتذہ کی رہائش کے کام آسکتے ہیں۔ مدرسہ کو مکمل طور پر مرمت کرایا جائے اور اس کا ''دہلی گو رنمنٹ کالج'' کانام رکھا جائے۔ انہوں نے مدرسے کو دہلی کالج میں تبدیل کرنے کے لیے فنڈ کی فراہمی کی بھی پیشکش کی، ساتھ ہی کمیٹی سے یہ درخواست بھی کی گئی کہ حکومت کی جانب سے دی جانے والی رقم کے علاوہ مزید مالی امداد منظور کی جائے۔ رپورٹ میں ٹیلر نے ایجنسی کے سربراہان کی اس خواہش کا بھی ذکر کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ دہلی کالج کا سکریٹری ٹیلر کو بنایا جائے۔[۲۶]

ٹیلر نے جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں سے اکثر کو حکومت نے منظور کر لیا۔ تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی نے ۱۹۲۴ء میں رقم مہیا کرادی۔[۲۷] اس کے علاوہ اس ادارے کو حکومت کی جانب سے بطور مالی امداد سات سو روپئے ماہانہ مختص کیے گئے۔[۲۸] ٹیلر کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے دہلی کالج کے قیام کے لیے سات ہزار ایک سو پندرہ روپے کے صرفے سے مدرسہ غازی الدین کی مرمت کرائی گئی۔ اس کام کے لیے یہ روپے حکومت نے ٹائون ڈیوٹی فنڈ سے دیے۔ ٹیلر کو کالج کے سکریٹری کا عہدہ سونپنے کے علاوہ اس ادارہ کی نگرانی کی ذمہ داری بھی تفویض کی گئی۔ ۱۹۲۵ء میں کالج کے قیام سے قبل اس مدرسہ میں صرف ایک مدرس تھے جن کا نام مولوی انعام اللہ تھا اور طلبا کی کل تعداد نو تھی۔[۲۹] کالج کے قیام میں چونکہ بہت سے مسائل درپیش تھے اور دشواریاں حائل تھیں اس لیے حکومت نے آہستگی کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیا۔

۱۸۲۸ء میں کالج میں شعبہ انگریزی کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی میں برطانوی ریزیڈنٹ کمشنر چارلس مٹکاف (Charles Theophilus Metcalf ۱۷۸۵ء۔ ۱۸۴۶ء) اور ان کے معاون ریزیڈنٹ ٹریولین دہلی کالج کے مقامی کمیٹی میں شامل تھے اور ہندوستان میں انگلیسیتوں کے مقاصد کے پرزور حامی تھے۔ یہ دونوں اس تبدل کے بنیادی محرک سمجھے جاتے تھے جسے الٹرا ریڈیکل (ultra-radical) تصور کیا جا رہا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں دہلی کالج میں ایک لاکھ ستر ہزار روپئے کے وقف سے مشرقی علوم کا سیکشن کھولا گیا۔ اس وقف کو اودھ کے نائب سلطان نواب اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں نے قائم کیا تھا۔ ان کے والد میر غلام حسین سلطنت مغلیہ کے زوال کو محسوس کرکے دہلی سے اس وقت ہجرت کر گئے تھے جب اس شہر کے رؤسا، اشرافیہ اور دانشور بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں سے کوچ کر رہے تھے۔[۳۰] انگریزی زبان کے ذریعے سے یوروپی علوم کی تعلیم اور انگریزی کے مطالعہ کے لیے ایک علاحدہ کالج[۳۱] کے قیام کا جو منصوبہ بنایا جارہا تھا وہ ۱۸۴۰ء کی دہائی میں اس وقت پورا ہو گیا جب مستقل طور پر ایک پرنسپل کی تقرری عمل میں آگئی۔

ابتدا میں وہ تمام طلبہ جو مدرسہ میں مشرقی زبانیں سیکھ رہے تھے انہیں انگریزی کلاس میں شرکت کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس اقدام کا طلبہ نے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا اور پچاس فیصد سے زائد طلبہ انگریزی کی کلاس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس سے مسائل پیدا ہونے لگے جس کا حل پندرہ اسکالر شپ کے ساتھ شعبہ انگریزی کے قیام کی صورت میں نکلا۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے جگہ مہیا کرانے اور انگریزی کے نئے کورس کے توسیعی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے نواب اعتماد الدولہ فنڈ کا استعمال کر کے کالج کمیٹی نے ایک انگریزی کالج قائم کیا، جس کو دہلی انسٹی ٹیوٹ کا نام دیا گیا۔[۳۲] اعتماد الدولہ کے داماد سید حامد علی خاں نے فنڈ کے غیر مناسب استعمال پر احتجاج کیا۔ کچھ ان کے احتجاج کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ تمام مذاہب کے روایت پسندوں میں انگریزی تعلیم کے خلاف ایک جذبہ بیدار ہو رہا تھا، دونوں سیکشن کو دو تین سال کے اندر علاحدہ کر دیا گیا۔ اگر طلبہ کی تعداد پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس مختصر مدت میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ مشرقی علوم کے طلبا اپنے شعبہ کو چھوڑ کر انگریزی شعبہ میں جانے لگے۔[۳۳] حال ہی میں قائم اس کالج نے جیسی ترقی کی تھی اس پر ڈائر کٹروں کی کچہری نے کافی اطمینان کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی کچہری نے اس امر کا بھی ذکر کیا کہ اعلیٰ طبقات کے ہندو اور مسلمان یوروپی تعلیم اور یوروپی سائنس و ادب کی مزید تحصیل کے آرزومند ہیں۔[۳۴] آخر ش انگلیسیتی موقف غالب آ گیا۔ مدرسہ غازی الدین امپیریل دہلی شہر کا وہ ادارہ ہے جہاں برطانوی حکومت کی مداخلت کے بعد جدید تعلیم کا آغاز ہوا۔

ولیم بینٹنک نے ۱۸۳۱ء میں دہلی کالج کا دورہ کیا۔ وہاں ان کو اس ادارہ کی تعلیمی صورت حال اطمینان بخش نہیں نظر آئی۔[۳۵] بینٹنک کے دورے کے چند برسوں کے اندر ٹریولین نے مستشرقی اور انگلیسیتی اراکین سے متشکل دہلی کی متوازن مقامی کمیٹی سے گورنر جنرل کو آگاہ کیا۔ یہ محدود اختیار کی حامل ایک انتظامی کمیٹی تھی جس کے اراکین کو ٹریولین نے تاریکی اور روشنی کے دو خانوں میں تقسیم کر کے جدید اور قدیم نظام کے حامیوں میں شمار کیا۔ بہر حال اس کا یہ گمان تھا کہ رائے عامہ مقبول عام تعلیم کے حق میں ہے جس کی وجہ سے مخالفین کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ کمیٹی سے باہر اس کے خلاف کچھ کہہ سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ سنسکرت، عربی اور فارسی جیسی 'دم توڑ چکی مشرقی زبانیں' دہلی کالج میں بے توجہی کا شکار ہو گئیں۔[۳۶]

مشرقی تہذیب و ثقافت اور مغلیہ حکومت کی یادگار فارسی زبان ۱۸۳۷ء میں منسوخ کر دی گئی اور دہلی Residency نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندستان کی ان ریاستوں سے جن سے اس کا اتحاد ہے اب سے صرف اور صرف انگریزی زبان میں ہی خطوط و درخواستیں قبول کرے گی۔(۳۷) ۱۸۳۵ء میں بینٹنک کی بنائی ہوئی یہ فیصلہ کن پالیسی نہ صرف ہر اس چیز کے لیے موت کا اعلان تھی جس کا تعلق قرون وسطیٰ اور مشرق سے تھا بلکہ یہ مغربی تہذیب و علوم اور انگریزی زبان کے ایک نئے دور کے آغاز کا نقیب بھی ثابت ہوئی۔ دہلی کالج بھی اس بدلے ہوئے منظر نامہ سے متاثر ہوا۔ اس ادارے کی کلاسیکی زبانوں کے طلبا کے لیے اس سے قبل جو وظیفے مختص تھے اس میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ ۱۸۳۳ء میں اس طرح کے وظائف جو طلبا کو دیئے جاتے تھے ان کی تعداد ۲۴۳ تھی جسے ۱۸۳۸ء میں گھٹا کر نواسی کر دی گئی۔(۳۸) چند برسوں کے اندر طلبا کی تعداد میں غیر معمولی کمی درج کی گئی اور سرکاری روداد کے مطابق اسی کو کالج کے زوال کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ مزید انحطاط پر قابو پانے کے لیے کالج کے مشرقی علوم کے شعبے کے واسطے مجموعی طور پر ہر ماہ ۴۵۲روپے کی رقم وظیفے کے لیے متعین کی گئی۔(۳۹) اس کے برعکس ۱۸۳۳ء میں شعبۂ انگریزی میں ۱۲۶طلبہ کو داخل کیا گیا تھا جن کی تعداد ۱۸۴۵ میں بڑھ کر ۲۴۵ تک پہنچ گئی۔ شہر کے باشندوں میں جدید تعلیم کے بارے میں جو شک و شبہ تھا اس کا گویا ازالہ ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔(۴۰)

۱۸۴۰ء کے آس پاس کالج کی زندگی میں کچھ اہم واقعات پیش آئے۔ جیمس ٹھامسن (James Thomason) کو گورنر جنرل بہ اجلاس (۱۸۳۶ء۔۱۸۴۲ء) لارڈ آکلینڈ(Lord Auckland۱۷۸۴ء۔۱۸۴۹ء) کے قرار داد کے مکمل نفاذ کے لیے شمال مغربی صوبوں کے اورینٹل کالجوں کی نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا۔(۴۱) انھوں نے دہلی کالج کی صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کی غرض سے ۱۸۴۱ میں دورہ کیا۔ اس کا مقصد مفید مشورہ دینا اور عملی تدابیر پیش کرنا بھی تھا تا کہ اس ادارے کی صورت حال بہتر اور قابل ستائش ہو سکے۔(۴۲) کالج کا دورہ کرنے کے بعد انھوں نے تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی کو یہاں کی صورت حال سے واقف کرایا اور ساتھ ہی انھوں نے کالج کے تعلیمی اور انتظامی ڈھانچے میں اہم تغیر و تبدل کا مشورہ دیا۔ یوروپی صدر مقام سے بہت دور واقع ہونے کی وجہ سے اس کالج کی منتقلی اور اورینٹل اور یوروپی تعلیم کی ایک ساتھ تحصیل کے لیے کالج کے دونوں شعبوں کے انضمام کا بھی مشورہ دیا۔ اس مشورہ کے پس پشت یہ منشا کارفرما تھا کہ ایسا کرنے سے مشرقی علوم و فنون پر مفید اثر مرتب ہوگا۔(۴۳)

کالج میں اصلاحات لانے کے لیے ٹھامسن کی جانب سے پیش کی گئی تجاویز کو حال ہی میں مقرر کیے گئے پرنسپل فلِکس بوٹروس نے عملی جامہ پہنایا۔(۴۴) کالج کی اصلاح کی گئی اور اس کی از سر نو تنظیم کی گئی اور مدرسین و عملہ کی تنخواہ بڑھائی گئی جس کے بہت دوررس نتائج نکلے۔ فلِکس بوٹروس نے انگریزی اور مشرقی علوم کے شعبوں کو ضم کر دیا۔ اس کو ضم کرنے کا بظاہر مقصد مشرقی علوم کے شعبہ کے معیار کو مغربی علوم کے شعبے کے معیار کے برابر لانا(۴۵) اور دونوں شعبوں کے طلبہ کے درمیان ایک ہی طرح کے مفید مطلب علم کی نشرواشاعت تھا۔ کالج کے نصاب تعلیم میں شامل سائنسی علوم، علوم ریاضی، اخلاقیات، فلسفۂ قانون، سیاسی معیشت، تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں یہ خیال تھا کہ ان کی تعلیم سے عصبیت اور تنگ ذہنی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔(۴۶) انضمام سے پہلے ان دونوں شعبوں کے طلبہ کا ایک ہی قسم کے مضامین میں امتحان لیا گیا اور اورینٹل شعبہ کے طلبا معیار کے معاملے میں شعبۂ انگریزی کے اپنے ہم عصروں کے برابر پائے گئے۔ بہر حال بوٹروس کے خیال میں اورینٹل سیکشن کے طلبا انگریزی سیکشن کے طلبہ سے بہت زیادہ فائق تھے۔(۴۷)

دہلی کالج میں کیے گئے اصلاحی اقدام کی بالخصوص 'اردو زبان کے ذریعے سے یہاں کے باشندوں کو یوروپی ادب کی تعلیم دینے' کے عمل کی، لیفٹیننٹ گورنر کی طرف سے از حد پذیرائی کی گئی۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ یہ 'یوروپ کی معیاری کتابوں' کے مقامی زبان اردو میں ترجمہ سے ممکن ہو سکا۔ بوٹروس نے ان کتابوں کے ترجمہ کی نگرانی اور اسی مقصد کے لیے کچھ کتابوں کی تالیف بھی کی تھی۔(۴۸) وہ کالج جو تقریباً سترہ برسوں سے غازی الدین مدرسہ کی عمارت میں چل رہا تھا اس کو کشمیری دروازے کے قریب مغل طرز کی ایک عمارت "دارا شکوہ لائبریری" میں منتقل کر دیا گیا۔ اس عمل سے کالج ٹھیک برطانوی دفاتر اور رہائش گاہوں کے درمیان پہونچ گیا(۴۹) جہاں ایک بار سر ڈیوڈ اوکٹر لونی (Sir David Ochterlony 1758-1825) نے دہلی کے برطانوی ریزیڈنٹ کی حیثیت سے قیام کیا تھا۔

نصاب تعلیم، نصابی کتابیں اور ترجمہ

۱۸۲۳ء میں تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی کی تشکیل کے دو ہفتہ کے اندر حکومت کی جانب سے اس کے اراکین کو ایک خط روانہ کیا گیا جس میں ان کو اس کمیٹی کے اراکین کی حیثیت سے تقرری کی اطلاع دینے کے علاوہ اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد بتائے گئے تھے۔(۵۰) خط کے جواب میں اراکین کمیٹی نے سائنسی مضامین کے تفوق و برتری اور سائنسی تحصیل علمی کی اثر پذیری میں

اپنے یقین کی بنیاد پر میکانیات(mechanics)، علم آب(hydrostatics)، علم الہوا (pneumatics)، بصریات(optics)، برقیات(electricity)، علم ہیئت(astronomy) اور علم کیمیا(chemistry) کی تعلیم کی پرزور سفارش کی۔ انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ سال کے مناسب ایام میں ان مضامین پر یا ان کی مخصوص شاخوں میں سے کسی ایک پر آیا شام کے وقت یا تعطیل کے دن عام لوگوں کے لیے خطبات علمی کا اہتمام کیا جائے اور ان خطبات میں اسکول اور کالج کے تمام منتظمین، اساتذہ اور طلبا کو شرکت کی اجازت ہو۔ اس خط میں انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ معقول فیس لے کر عوام کو بھی ان خطبات میں شرکت کی اجازت دی جائے۔[۵۱] اگرچہ یہ مشورہ اور تجویز کلکتہ کے ہندو کالج کے لیے تھی لیکن تقریباً یہ تمام مضامین، جن کا مشورہ جنرل کمیٹی کے اراکین نے سائنس کے آئندہ طلبا کے لیے دیا تھا، دہلی کالج کے نصاب تعلیم میں شامل کر لیے گئے۔ علاوہ ازیں علوم و فنون کی روایتی اور جدید شاخوں کو بھی اس میں شامل کیا گیا تھا۔[۵۲] ہندستان میں اس طرح کی تعلیم کے اجرا اور عوام میں اس کی نشر و اشاعت کی غایت اصلی کیا تھی اس کا اظہار یقینا جنرل کمیٹی کی اس تجویز سے ہو جاتا ہے۔[۵۳] بعد میں سرکاری اداروں میں سائنسی موضوعات پر عوامی خطبات کا انعقاد معمول بن گیا۔ اس نوع کے خطبات دہلی کالج میں بھی اردو زبان میں منعقد کیے گئے۔

کالج کا نصاب تعلیم بنیادی طور پر جدید مضامین پر مشتمل تھا۔ ان مضامین کی تحصیل کرنے والے دونوں جماعتوں کے طلبا پر ان کے حسب دلخواہ عقلیت پسندانہ اثرات مرتب ہوئے۔ دہلی کالج کے ایک استاد اور فارغ التحصیل طالب علم کے سوانح نگار ایڈون جیکب نے اس کے بارے میں ان الفاظ میں اپنا مشاہدہ پیش کیا ہے: عربی زبان میں پڑھائے گئے قدیم فلسفہ کے تصورات کو جدید سائنس کے زیادہ عقلیت پسندانہ اور تجرباتی نظریات کے سامنے در کنار کر دیا گیا۔ ''فطرت خلاء سے نفرت کرتا ہے'' اور ''زمین کائنات کا غیر متحرک مرکز ہے'' جیسے پرانے خیالات کا دہلی کالج کے اورینٹل شعبہ میں اعلیٰ درجہ کے طلبا نیز انگریزی شعبہ کے طلبا نے عام طور پر مذاق اڑایا۔[۵۴] یہاں کے نصاب تعلیم میں اسلامی قوانین (بشمول شیعہ اور سنی فقہہ) کو شامل کیا گیا تھا لیکن مطالعہ مضمون کے طور پر دینیات کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ تمام مضامین اردو اور عربی کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے۔

بوٹروس نے انگریزی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کی مجوزہ اسکیم کو نافذ کرنے کی سعی کی کیوں کہ وہ خود بھی ہندستان کی زبانوں کے ذریعے سے جدید تعلیم کی تدریس کے قائل تھے۔ سب سے پہلے اس نے طبیعیات(physics)، معاشیات(economics)، علم تاریخ (history)، فلسفہ (philosophy) اور قانون(law) پر دستیاب اہم کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے بیس اسکالروں کی تقرری کی۔ علاوہ ازیں قانون میں وہ کتابیں بھی شامل تھی جو برطانوی ہندستان میں اس وقت قانونی معاملات میں عملاً استعمال کی جاتی تھیں۔[۵۵] اس نے دہلی کالج کی طرف سے بیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانے کی بھی ذمہ داری لی اور یہ تجویز پیش کی کہ اس صوبہ کا ہر اسکول اور کالج چند برسوں میں اسّی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجام دے۔[۵۶] اپنے منصوبہ کو نافذ کرنے کے لیے اس نے مقامی اساتذہ، مولویوں، پنڈتوں کو بھی ملازم رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس امید کے بغیر کہ مقامی زبان میں پہلا ترجمہ ہر قسم کے نقص سے پاک ہو گا۔ اس نے ترجمہ کے حقیقت پسند منصوبہ کا مشورہ بھی دیا۔ وہ دستیاب ذرائع کے ساتھ کام کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ چنانچہ اس نے ان افسروں کو یہ مشورہ دیا جو انگریزی تعلیم کے اجرا کے ذمہ دار تھے یہ ہدایت کی کہ وہ عمدہ معیاری تصانیف کا ترجمہ کریں اور اگر (۔۔۔)خوش اسلوب تراجم نہ مل سکیں تو محض صحیح تراجم سے خوش ہو جانا چاہیے۔[۵۷] ایک سو ساٹھ عطیہ دہندگان کے مالی تعاون سے ۱۸۴۳ء میں ”انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی“(The Society for the Promotion of Knowledge in India through the Medium of the Vernacular Languages) قائم کی گئی۔ ان عطیہ دہندگان میں باون یوروپی افراد اور اودھ اور حیدرآباد کے چند نوابین شامل تھے۔ سوسائٹی کی منتظمہ کمیٹی ایک ہندوستانی شخص کے علاوہ تمام تر یوروپی افراد پر مشتمل تھی۔ ٹومس مٹکاف(Thomas Metcalfe)، چارلس گرانٹ، اے۔ سی۔ ریونشا (A. C. Ravenshaw)، فیلکس بوٹروس اور کلکتہ کے دوارکا ناتھ ٹیگور اس کمیٹی کے اراکین تھے۔[۵۸] دہلی ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے جو کارنامہ انجام دیا وہ اصلاح شدہ دہلی کالج میں مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔[۵۹] بوٹروس کے جانشین ڈاکٹر الوئس اسپرنگر نے بھی کالج کے ترجمہ کی سرگرمیوں میں بہت گہری دلچسپی لی۔ انھوں نے سوسائٹی کے فائدہ کے پیش نظر ترجمے کا بیڑا اٹھانے کے لیے چند اسکالروں کو ترغیب دی۔ ان میں سے ایک سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء)

تھے جنھوں نے دہلی کالج کے لیے علم ریاضی سے متعلق ایک فارسی مقالے کا ترجمہ کیا جو ان کے نانا خواجہ فرید الدین کی تالیف تھی۔(۶۰)

سائنس کے مضامین سے متعلق نصابی کتابوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے علم نباتات (botany)، علم تشریح الاعضا(anatomy)، علم طب (medicine)، علم جراحی (surgery)، معدنیات (mineralogy)، علم کیمیا (chemistry)، طبیعیات (physics)، جغرافیہ اور علوم ریاضی کی مختلف شاخوں کی دو در جن سے زائد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے وینڈ کی انالاٹکل جیو میٹری، ینگ کی ڈائنامکس اور اسٹیٹکس، ویبسٹر کی ہائیڈروا سٹیٹکس، فیلپ کی اوپٹکس، ٹریل کی فزیکل جیوگریفی اور ہیٹ، ہائیڈرالکس اور ڈبل ریفریکشن اور پولرائیزیشن پر حال ہی میں لائبریری آف یوزفل نالج کے زیر اہتمام شائع کی گئی کتابیں شامل تھیں۔(۶۱) ۱۸۵۷ء تک، جب لوگ استعماری تجدد کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، طلبہ کو اردو کے ذریعے سے پڑھانے کے لیے تمام مضامین پر تقریباً ایک سو تیس کتابوں کا آیا ترجمہ ہو چکا تھا یا ان کو ضرورت کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا یا ان کو تیار کر لیا گیا تھا۔(۶۲)

اردو اور دیگر مقامی زبانوں میں جدید سائنسی علوم پر کتابیں دستیاب نہیں تھیں یا چند کتابیں میسر تھیں۔ اس امر کو ذہن میں رکھنے سے کوئی بھی فی الفور یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس معاملے میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے جو کردار ادا کیا تھا وہ نہ صرف کالج کے اسکالروں کے ذہنوں کے تجدد کے لیے بلکہ مجموعی اعتبار سے معاشرہ کے تجدد کے لیے بھی انتہائی اہم تھا۔ چھاپہ خانے کے فروغ کا ایک ناقابل اندازہ فائدہ یہ ہوا کہ تیار کی گئیں اور ترجمہ شدہ کتابیں خاص کر مغربی سائنسی علوم کی کتابیں ادارہ کی چہار دیواری سے باہر چلی گئیں، یہ کتابیں بڑے پیمانے پر قارئین کو مناسب قیمت پر دستیاب کرائی گئیں۔

اس طرح دونوں شعبوں کو ضم کر کے مفید مطلب علم، بشمول یوروپ کے علوم اور فنون کو طلبا کے لیے قابل قبول بنایا گیا جو ان میں سے چند طلبا کے لیے کسی وجہ سے ۱۸۴۰ء سے پہلے دسترس سے باہر رہا ہوگا۔ اردو کو ۱۸۴۳ تک اس کالج میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کر لیا گیا تھا۔ اس اہم پالیسی کا عین مقصد روشن ضمیر اور آزاد خیال افراد پیدا کرنا تھا اور برطانوی حکومت کے لیے مددگاروں کی ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو تعلقی میدانوں میں قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔

فارغ التحصیل طلبا کے اشغال

دہلی کالج کے قیام کی پہلی تین دہائیوں میں شہر و اطراف کے بہت سارے طلبا نے وہاں داخلہ لیا۔ ان میں سے بعض کے مستقبل بہت روشن تھے۔ موہن لال (۱۸۷۷ء۔ ۱۸۱۲ء) ان پہلے طلبا میں سے ایک تھے جو ۱۸۲۷ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ کالج میں داخل ہونے والوں میں رام کشن، شیو پرشاد، جواہر لال، شہامت علی اور ہادی حسین شامل تھے۔ ان کے پہلے تین ہم جماعت اپنے ہی ادارہ میں ماسٹر کے عہدہ پر مقرر کیے گئے۔ موہن لال اور ان کے سچے دوست شہامت علی نے بھی ایک مختصر مدت تک اس ادارہ میں تدریس کا کام انجام دیا۔ بعد میں وہ دونوں منشی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے انگلینڈ کا سفر کیا اور انگریزی زبان میں کتابیں لکھیں۔ شہامت علی کپتان واڈے کی معیت میں بطور منشی کابل گئے اور بالآخر ریاست اندور کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔[۶۳] اپنی ملازمت کے زمانہ میں موہن لال نے برطانوی افسران کے ساتھ سفارتی مشن میں شرکت کی اور سامراجی حکومت کے لیے ثقافتی اور سیاسی ثالث کے طور پر اپنا کردار ادا کیا۔[۶۴]

رام چندر (۱۸۲۱ء۔ ۱۸۸۰ء) نے ۱۸۴۱ میں دہلی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۴۴ء میں کورس کی تکمیل کی۔ اس کے بعد اسی کالج میں سائنس اور ریاضی کے استاد کے طور پر ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے لیے ریاضی اور سائنس کی مختلف کتابوں کا ترجمہ کرنے کی ان کو ذمہ داری بھی دی گئی۔ شروع میں انہوں نے ماہنامہ خیر خواہ ہند کے چند شمارے شائع کیے۔ اس رسالے کا نام بعد میں محب ہند ہو گیا۔ ان مضامین کا کلیدی ہدف یہ تھا کہ کس طرح جدید افکار و نظریات کو اردو زبان کی وساطت سے مقبول عام بنایا جائے۔ وہ تعلیم نسواں کے بڑے حامیوں میں سے تھے اور اس کی پر زور حمایت کرتے تھے۔[۶۵] اسی طرح جدید سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں جو نئی ایجادات اور دریافتیں سامنے آتی تھیں ان کو وہ اپنے ہفتہ وار اردو مجلہ قران السعدین میں شائع کرتے تھے۔ انھوں نے ریاضی اور سائنس کے میدان میں بہت سارے نمایاں کام انجام دیے اور ان سے متعلق اپنی مقبول عام تحریروں کو نصف ماہی جریدہ فوائد الناظرین میں بڑے اہتمام سے شائع کیا۔[۶۶] لیکن علوم ریاضی ہی کی وہ کتابیں تھیں جو ان کی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہوئیں اور ریاضی ہی وہ میدان علمی تھا جس میں وہ یکتا و یگانہ قرار دیئے گئے۔[۶۷] ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ ریاست پٹیالہ میں شعبۂ تعلیم کے صدر مقرر ہوئے۔[۶۸] اسی طرح گورنر جنرل بہ اجلاس نے انھیں ۱۸۷۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا فیلو (fellow) مقرر کیا۔[۶۹]

وہ طلبہ جو ۱۸۴۰ء کی دہائی میں کالج سے وابستہ ہوئے شہرت کے بام عروج پر پہنچے اور اپنے اپنے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان میں محمد حسین آزاد(۱۸۲۹ء۔۱۹۱۰ء)، نذیر احمد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۳ء)، ذکاء اللہ (۱۸۳۲ء۔ ۱۹۱۵ء-) اور پیارے لال آشوبؔ (۱۸۳۸ء۔ ۱۹۱۶ء) جیسے ممتاز طالب علم شامل تھے۔ پیارے لال نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں بریلی سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور پھر کامیابیوں کا یکے بعد دیگرے سفر طے کرتے رہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد انہیں گڑ گاؤں اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی ذمہ داری ملی۔ وہ دہلی نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی مقرر ہوئے۔ عظیم بغاوت کے بعد مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں کا قیام عمل میں آیا اور ملک کے دانشوروں کے اندر زبردست منتھن شروع ہوا۔ انھیں خطوط پر شہر دہلی کے دانشوروں اور برطانوی افسروں نے ۱۸۶۵ء میں دہلی سوسائٹی کو قائم کیا۔ پیارے لال کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ اس کی ورکنگ کمیٹی کے اراکین میں دہلی کالج کے پرنسپل بھی شامل تھے۔ یہ امر کافی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے اس کے قیام میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کا اہم ترین مقصد سماجی اصلاح اور ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس سوسائٹی کا دہلی کالج اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں سے بڑا گہرا تعلق رہا۔ اس کے اراکین کی بصیرت اور دوراندیشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس کے کتب خانے اور دارالمطالعہ سے متعلق ضابطہ میں اس شق کو داخل کیا کہ یہ سوسائٹی کوئی مذہبی کتاب نہیں خریدے گی۔ [۷۰]

پیارے لال کا تبادلہ ۱۸۶۹ میں لاہور شہر میں واقعہ پنجاب بک ڈپو میں مترجم کی حیثیت سے ہوگیا۔ [۷۱] علاوہ ازیں ان کو سرکاری اخبار اور بعد میں ایک رسالہ اتالیق پنجاب کے مدیر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ۱۸۷۶ میں ان کو سرشتہ تعلیم میں کیوریٹر (Curator) کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ یہاں انھوں نے اچھی کارگزاری کا مظاہرہ کیا جس کے صلے میں ان کو انسپکٹر مدارس کے عہدے کے لیے منتخب کیا گیا۔ انھوں نے اس حیثیت سے ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۵ء کے دوران میں دہلی اور پنجاب کے دیگر علاقوں میں کام کیا۔ ان کو ریاست پٹیالہ کے سرشتہ تعلیم کے منیجر کے عہدے پر بھی مامور کیا گیا۔ [۷۲] آشوبؔ، پیارے لال کا تخلص تھا۔ ابتداءً انھوں نے اردو میں شعر کہے لیکن وہ اپنے اس شوق کا بہت دور تک ساتھ نہ دے سکے۔ انھوں نے تعلیم سے متعلق مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین اپنے رسالے اتالیق پنجاب میں شائع کیے، ہندستان کی تاریخ قصص الہند لکھی، اور

انگریزی کی کتابوں کا تاریخ انگلیشیہ اور تاریخ جلسہ قیصری کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ ہندو کالج کے ٹرسٹی تھے۔ (۷۳) حکومت نے ۱۸۹۲ میں ان کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازا۔ (۷۴)

ذکاء اللہ نے ۱۸۴۵ء میں محض بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں انھوں نے مشرقی علوم کے شعبہ میں تقریباً چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس دوران میں انھیں حکومت سے وظیفہ بھی ملتا رہا۔ زمانہ طالب علمی ہی میں، جب ان کی عمر محض سترہ سال تھی، انہوں نے تحفت الاحباب کے نام سے علم ریاضی کی ایک کتاب شائع کی۔ اس باصلاحیت نوجوان کی یہ کاوش اس قدر مقبول ہوئی کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن محض چار دن میں فروخت ہو گیا۔ (۷۵) ذکاء اللہ نے ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی سرگرمیوں میں بھی خوب حصہ لیا اور طالب علمی کے زمانے میں کئی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ (۷۶) انھیں کالج میں مختلف اعزازات، متعدد طمغے اور انعامات سے نوازا گیا۔ (۷۷)

انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی آغاز ریاضی کے مدرس کے طور پر ۱۸۵۱ء میں دہلی کالج سے کیا۔ پھر ان کی تعلیمی خدمات کا سلسلہ دراز تر ہوتا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں وہ دہلی میں گورنمنٹ نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ اس کے تین سال کے بعد الہ آباد میں واقع میور سینٹرل کالج میں ورناکولر سائنس اور ادب کے پروفیسر منتخب ہوئے اور ایک طویل عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے اور پھر ۱۶/ اپریل ۱۸۸۷ء کو خود بخود سبکدوش ہو گئے۔ (۷۸) وہ الہ آباد یونیورسٹی کے تاحیات پروفیسر بھی رہے اور اس کے سینیٹ کے ممبر بھی جسے اس زمانے میں فیلو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ (۷۹) اسی طرح انھیں مسلم اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ، کا بھی ۶/ جولائی ۱۸۸۷ء کو ریاضی کا تاحیات اعزازی پروفیسر بنایا گیا۔ (۸۰)

ذکاء اللہ ایک بسیار نویس مصنف اور کہنہ مشق مترجم تھے۔ انھوں نے متعدد موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں جن میں تاریخ، سوانح حیات، علوم ریاضی، طبیعیات، جغرافیہ اور علم اخلاق جیسے موضوعات شامل ہیں۔ وہ اردو زبان کے پہلے جدید تاریخ نگار تھے۔ یہ امر زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اردو زبان کے ذریعے سے جدید سائنس کی نشر و اشاعت کا کام کیا۔ جدید سائنس اور تکنالوجی کے نتائج کو انھوں نے کلاس روم کے لکچروں کی صورت میں متعدد تصانیف کی اشاعتوں کے ذریعے سے اور اردو کے بہتیرے معتبر رسائل و مجلات میں اپنے مضامین شائع کرا کے جدید ہندستان کو نئے سرے سے آراستہ کرنے کی مہم چلائی۔ انھوں

نے ۱۸۷۲ء میں پرائز نوٹیفکیشن کے تحت ۲۳ مقالے پیش کیے جس پر انھیں ڈیڑھ ہزار روپے کے نقد انعام سے نوازا گیا۔[۸۱] اسی طرح انہوں نے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے تعلیم نسواں کے فروغ میں اہم کردار نبھایا جس کے اعتراف میں انھیں ۱۸۶۴ میں خلعت سے نوازا گیا۔[۸۲] حکومت برطانیہ نے سبکدوشی کے دو ماہ قبل جشن جوبلی کے دوران میں ۱۸/ فروری ۱۸۸۷ء کو انھیں شمس العلماء وخان بہادر کے لقب سے سرفراز کیا۔[۸۳]

نذیر احمد جو ۱۸۴۲ء میں ضلع بجنور کے ایک گاؤں سے دہلی آئے تھے، جنوری ۱۸۴۶ء میں دہلی کالج میں داخلہ سے پہلے مولوی عبد الخالق کے یہاں تقریباً ساڑھے تین سال تک زانوئے تلمذ تہہ کیا۔[۸۴] وہ اپنے ناصحانہ کاموں میں اصغری، اکبری، ابن الوقت اور مبتلا جیسے ناقابل فراموش افسانوی کرداروں کی تخلیق کرنے، اردو کے پہلے مبینہ ناول نگار کی حیثیت سے اور نو آدباتی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہونے کی بنا پر شہرت رکھتے ہیں۔ یقیناً وہ متنوع الخصائص شخصیت کے مالک تھے اور ان کی علمی، ادبی اور انتظامی زندگی کے کئی اور پہلو ہیں۔ وہ برطانوی حکومت میں ایجوکیشن آفیسر تھے اور نظام کے حکومت میں ممتاز مقام پر بھی فائز رہے۔ انھوں جوش وخروش کے ساتھ انگریزی تعلیم کی حمایت کی اور مسلمانوں اس کی نشر واشاعت کی غرض سے لمبی لمبی تقریریں کیں، طویل تحریکی نظمیں پڑھیں اور سر سید کے قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس / کانگریس کے پلیٹ فارم کا بھی استعمال کیا۔ ان کی تقریر کی فصاحت و بلاغت اور منفرد لب ولہجہ کا سامعین پر مسحور کن اثر مرتب ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو مقبول کرنے میں انھوں نے حتی الوسع جدوجہد کی۔ انھوں نے اپنی اصلاحی شاعری کو یکجا کر کے مجموعہ نظم بے نظیر کے عنوان سے مرتب کیا، اور خطبات کی دو جلدیں لکچروں کا مجموعہ کے نام سے شائع کیں اور سات ناصحانہ ناول لکھے۔ دراصل وہ جدید ذہن کے مالک اور صاحب بصیرت اسلامی عالم تھے۔ ان کی وسیع علمی لیاقت، بصیرت اور جدید ذہنیت کا اندازہ ضابطۂ اخلاق کے موضوع پر ان کی کتاب الحقوق والفرائض کی تین جلدوں اور اجتہاد اور امہات الامہ جیسی دیگر کتابوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ اجتہاد کا موضوع یہ ہے کہ مذہبی کتب میں واضح ہدایات کی غیر موجودگی میں کس طرح رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی مناسب نتیجے پر پہنچا جائے اور امہات الامہ میں ازواج مطہرات کو عام انسانوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔[۸۵] قرآن کی نامکمل تفسیر -مطالب القرآن- بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ ان کے علاوہ وہ کئی اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے چند کتابوں کا ترجمہ بھی کیا

ہے۔ ان کے تراجم کی معاصر ہندستانیوں اور برطانوی عہدیداروں نے خوب خوب پذیرائی کی۔ انھوں نے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر رہتے ہوئے حال ہی میں متعارف انکم ٹیکس ایکٹ اور انڈین پینل کوڈ کو اردو میں منتقل کیا۔ ان کی ماہرانہ ترجمہ نگاری نے ڈائریکٹر تعلیم عامہ ایچ۔ ایس۔ ریڈ (H. S. Reid) کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرایا۔ انجام کار اس نے نذیر احمد کو ترقی دے کر ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور کرنے کی سفارش کی۔[۸۶] ایک بار پھر اردو میں شاندار ترجمے کی بنیاد پر حیدرآباد میں اپریل ۱۸۷۷ میں انھیں صدر تعلقہ دار کا اعلیٰ ترین عہدہ ملا اور سب سے زیادہ تنخواہ ملی۔ انھوں نے ایمیڈی گیئیمیں (Amedee Guillemin) کی علم نجوم پر ایک اہم کتاب The Heavens کا ترجمہ -سماوات- کے نام سے کیا تھا۔ انہیں جون ۱۸۹۷ میں شمس العلماء کے لقب اور خلعت نوازا گیا۔ ان کے وسیع علمی کارناموں کے مد نظر یونیورسٹی آف اڈنبرا نے ۱۹۰۲ میں ڈاکٹر آف لاز (L.L.D.) کی اعزازی ڈگری اور یونیورسٹی آف پنجاب نے ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ (D.O.L.) کی ڈگری ۱۹۱۰ میں عطا کی۔[۸۷]

انگریزی تعلیم اور کشادہ ذہنی کی تشکیل

دہلی کالج کی انگریزی تعلیم اور وہاں کی مجموعی تعقلی فضا نے طالب علموں کی ذہنیت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اس تعلیم اور اس فضا نے طلبا کی کشادہ ذہنی کی جو تشکیل کی وہ ادارے کا سب سے اہم پہلو ہے اور سب سے بڑا کارنامہ بھی۔ رام چندر نے کالج میں اپنی تعلیمی زندگی کو یاد کرتے ہوئے کالج کے طلبا پر سائنس کے اثر کا ذکر یوں کیا ہے:

> "(۔۔۔) میں ۱۸۳۳ میں دہلی انگریزی کالج میں داخل ہوا اور پوری محنت سے تعلیم حاصل کی۔ جب میں نے کچھ انگریزی سائنس کی تحصیل کر لی تو مجھے بتوں اور بے شمار دیوی دیوتاؤں کی پوجا نا معقول نظر آنے لگی۔ (۔۔۔) جوں جوں میں اپنے انگریزی کے علم میں ترقی کرتا گیا، مذہبی اہمیت کے حامل تمام خیالات میرے ذہن سے دور ہوتے گئے۔ مجھے مذہبی بات سے زیادہ بیہودہ اور بیکار کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ کتابی مذہب کو میں نے بالکل غلط تصور کیا (۔۔۔)۔"

مجھے حرکت زمین جیسے سائنسی مضامین اور ان موضوعات پر بحث و مباحثہ میں مزہ آنے لگا جو ہندو مت اور اسلامی فلسفہ کے بالکل برخلاف تھے۔[۸۸]

کالج میں سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے ذکاء اللہ کا اپنا تجربہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ انکے لیے یہ کوئی ایسی جادوئی اور سحر زدہ زمین میں داخل ہونے جیسا تھا جہاں یہ خبر نہیں ہوتی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ انہوں نے سی۔ ایف۔ انڈریوز کے سامنے اپنے دور طالب علمی کو یاد کیا۔ کتنے شوق سے سائنسی لکچروں کو سنا جاتا تھا۔ یہ انسانی دماغ کے مکمل مخفی حصے میں داخل ہونے کے مشابہ تھا۔ نوجوان طلبہ بھی پر جوش اساتذہ سے پڑھتے تھے۔ انہیں نامعلوم کیمیائی گیسوں سے حیرتناک تجربہ کرنے کی اجازت تھی۔ انہیں مقناطیسیات کے رازہائے سربستہ میں غوطہ لگانے کے لیے مدعو کیا گیا جو اس وقت تازہ تفتیش شدہ سائنس کے طور پر ابھر رہی تھی۔ ابھی بہت کچھ آگے آنا باقی تھا لیکن ان چیزوں نے ان کے سامنے بالکل ایک نئی دنیا پیش کر دی تھی۔[۸۹]

ذکاء اللہ کے تجربہ کی روشنی میں انڈریوز نے چند باتوں پر زور دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سائنسی تجربات نے ان کے خیالات کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ وہ ہمیشہ تازہ انکشاف کی توقعہ کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں خود کو اس معاملے میں پیش رو سمجھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے خواب دیکھے 'اور سائنسی تصورات کی حسین و جمیل دنیا آباد کی۔[۹۰] انڈریوز نے واضح کیا کہ 'قدیم دہلی کالج میں دی گئی تعلیم کا سب سے مشہور پہلو وہ تھا جس کا تعلق سائنس سے تھا'۔ کالج میں سائنس کا 'شوق سب سے مقدم تھا اور یہ بہت جلد شہر کے اندر طلبہ کے گھروں میں بھی پھیل گیا جہاں والدین کی موجودگی میں جہاں تک ممکن ہو سکا نئے نئے تجربے کیے گئے۔[۹۱]

ذکاء اللہ یقیناً ایک آزاد خیال اور صلح پسند شخص تھے۔ محض ان کے اخلاق کی قوت سے تمام مذاہب کے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ ان کے متعدد ہندو اور عیسائی دوست تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے فلسفہ، ادب، موسیقی اور حکمت کی خوب تعریف کی۔ وہ ان کی کفایت شعاری، ان کی معتدل زندگی، ان کی تجارتی عادتیں، معیاری صنعت کاری اور ان کی دوراندیشی کی بھی تعریف کرتے تھے۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ ہندوؤں نے پوجا کرنے کی حد تک ان کا احترام کیا۔ ہندوؤں کو بھی ان میں اپنی قوم کا سب سے مخلص مسلمان دوست نظر آتا تھا۔ نذیر احمد نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے رشتہ کو اتنا قریبی بتایا جیسا چولی دامن کا ساتھ۔ یعنی وہ قدرتی طور پر ایسے لاینفک تھے کہ نوآبادیاتی صورت حال میں ان دونوں کے مفاد ایک اور یکساں تھے۔[۹۲] انہوں نے آپسی رشتوں کو مزید استوار کرنے کی نصیحت کی کیونکہ ناموافقت ان کے مشترکہ مفاد کے حق میں نہیں ہوگا۔[۹۳] ذکاء اللہ کے کچھ روایت پسند مسلم دوستوں نے انہیں نیچری کہا جو کہ نیم عقلیت پسندی

کے لیے ایک ذلت آمیز اصطلاح تھی جو عام طور پر سرسید احمد اور ان کے حامیوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی کیوں کہ وہ سائنس، مذہب اور فطرت کے درمیان ایک طرح کی مصالحت کے متمنی تھے۔ اس کی وجہ سے ذکاء اللہ کا ایمان مشکوک ٹھہرا اور ان کے دوست ان کے گھر پانی پینے سے بھی گریز کرنے لگے۔(۹۴)

نذیر احمد سے زیادہ دہلی کالج کا کوئی اور فارغ التحصیل یوروپ کے سائنسی اور تکنیکی کارنامے کو سراہنے والا نہ تھا۔ وہ کالج کے دوسرے فارغین بطور خاص موہن لال اور پیارے لال(۹۵) کی طرح بار بار ریل، اسٹیمر، تار برقی اور متعدد قسم کی مشینوں کا حوالہ یوروپی بالادستی کی مثال کے طور پر دیا کرتے تھے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ کسی بھی قوم کی دنیاوی ترقی اور فلاح و بہبود کا زیادہ تر انحصار سائنس اور تکنالوجی کی ترقی پر ہوتا ہے۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں ان چیزوں کی کمی ہی ملک پر برطانیہ کی حکمرانی کی اصل وجہ تھی۔(۹۶) سائنسی ایجادات کی وجہ سے جنگی اسلحے میں روز بروز بہتری پیدا ہو رہی تھی۔ اس میدان میں صرف یوروپی ممالک ہی ایک دوسرے کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک نکتہ یہ بیان کیا کہ کسی بھی حکومت کا تسلسل اور دوام زیادہ تر سائنسی برتری پر منحصر ہوتا ہے۔(۹۷)

انگریزوں ہی کی [ملکی] فتوحات کو دیکھو۔ (۔۔۔) ہر چند یہ فتوحات بھی بجائے خود معظمات الامور ہیں۔ مگر ان سے معظم تر انگریزوں کی سائنٹفک (علمی) فتوحات ہیں۔ ملکی فتوحات کے ذریعے سے انگریز ہم کو اسی قدر مطیع کر سکتے تھے (۔۔۔) کہ طوعاً کرہاً ہم ان کو خراج دیں۔ لیکن سائنٹفک فتوحات کے ذریعے سے انھوں نے (ہر معاملے میں) ہم کو اپنے بس میں کر لیا۔ (۔۔۔) یہ ہے سائنٹفک حکومت جس نے تمام رعایا کو جکڑ بند کر رکھا ہے۔(۹۸)

حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے نذیر احمد کو سائنس سے فطری بے رغبتی تھی۔ البتہ انہوں نے کالج میں ماسٹر رام چندر سے سائنس کا درس ضرور لیا تھا۔ یہ وہی رام چندر تھے جنہوں نے نذیر احمد کی طالب علمی کے دوران میں عیسائیت قبول کر لی تھی اور ان پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ مزید یہ کہ سائنس کالج کے تعقلی ماحول میں اس حد تک سرایت کر گیا تھا کہ تنگ ذہن اور کٹر مذہب پرست کے علاوہ کوئی اور اس کے اثر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ نذیر احمد تاحیات سائنس کی اہمیت پر اصرار کرتے رہے اور اس مضمون کے تعلق سے اپنے علم کا اظہار بھی کرتے

رہے جس کی تحصیل انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں کی تھی۔ان کی ذہنیت کے تبدل میں کس طرح اس تعلیم نے بنیادی کردار ادا کیا تھا اس کا بیان نذیر احمد نے کیا ہے:

معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (تعدیل)، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہادی اعلیٰ بصیرت یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں (۔۔۔) مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکھل کھڑا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیب کا متجسس، برخود غلط (۔۔۔) مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔ (۔۔۔) مجھ کو دینی دنیاوی جو فائدہ پہنچا کالج کی بدولت۔(۹۹)

ادارے کی تعلیمی زندگی پر سائنس کے جاری وساری اثر کا مزید بیان کالج کے زمانے کی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کا عمل تھا کہ اس ادارے کے احاطے میں مسلسل ٹکراتی ہوئی سائنس کی لہر دار پرزور گونجوں کو ان سنا کرنا خارج از امکان تھا۔ سائنسی ماحول کی نفوذپذیری کی ناگزیریت نے مذہب اسلام میں ان کے یقین کو زبردست طریقے سے جھنجھوڑ دیا۔(۱۰۰) ادارے کی پہلی پیڑھی کے طالب علم موہن لال نے غیر عقلیت اور رسوم پرستی میں ملوث ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کی مذمت کی۔ اس کا اظہار بھانت بھانت کے دیوی دیوتاؤں کی پوجا اور مختلف النوع مذہبی رسمیں ادا کرنے سے ہوتا تھا۔ ان کے خیال میں یہ تمام چیزیں ہندوؤں کی جہالت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔ انھوں نے ان امور کے تئیں اپنے عقلیت پسند رویے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''ہندو مرد و عورت نہانے کے بعد اپنے معبودوں کی تصویروں کو پوجتے ہیں جو دیواروں پر نقش ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ کے چار سر ہوتے ہیں اور کچھ کے سر بندروں کے ہوتے ہیں جنہیں وہ پھولوں اور پھلوں کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ یہاں نری جہالت کی نمائش ہوتی ہے اور ہوش و حواس سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ ذہین مخلوق احمق بن گئی اور پتھروں، پانی اور آگ سے عقیدت پیدا کر کے دھوکہ کھا گئی۔ مجھے یقین ہے یہ سب انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔'' (۱۰۱)

سائنس کا علم ہندو اور مسلم طلبا کے تسلیم شدہ نظریۂ کائنات سے بلا واسطہ متصادم ہو گیا۔ اس صورت حال کی برطانوی عہدیداروں اور مشنریوں کی ایک بڑی تعداد نے پیش بینی کر دی تھی۔ ڈاکٹر چمن لال نے اپنے دوست رام چندر کے ساتھ جولائی ۱۹۵۲ء میں عیسائیت قبول کر لی

تھی۔[۱۰۲] چمن لال جدید ادویات کے مشہور حاذق اور دہلی میں معاون سرجن تھے۔[۱۰۳] نذیر احمد کو بھی اسلام کو ترک کرنے اور عیسائیت کو قبول کرنے کے dilemma سے گزرنا ہی پڑا تھا۔ کالج کی تعلیم ہی ان کے غیر مقلدانہ مذہبی رجحان کے فروغ اور عالمی مذہب سے ان کی قربت کا آلہ کار بنی۔ اسی طرح ان کے عمر بھر کے دوست ذکاء اللہ کے بارے میں بھی یہ افواہ اڑی کی انھوں نے عیسائیت سے متاثر ہو کر اس کو اختیار کر لیا ہے کیوں کہ ان کی رام چندر سے بہت زیادہ قرابت تھی۔[۱۰۴] ان کے متعلق دہلی کے باشندوں کی قیاس آرائیوں میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں رہی ہو گی اور غالب گمان ہے کہ شاید ایسا کوئی معاملہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس سے اس سچ کا یقیناانکشاف ہو جاتا ہے کہ کالج میں دی گئی تعلیم مذہبی شدت میں تخفیف کا سبب بن رہی تھی اور اس کالج کے طلبا اپنے مذہب کے دائروں سے پرے سوچنے لگے تھے۔ پیارے لال کی مسلمانوں کے نزدیک ایک ولی کی حیثیت سے اور ہندوؤں کے نزدیک ایک دیوتا کی حیثیت سے شناخت[۱۰۵] بھی اس کالج کے ایک فارغ التحصیل کی خیر خواہی اور فیض رسانی کی گواہی دیتی ہے کہ ان کے نزدیک معاشرتی معاملات میں مذہبی رُورعایت سے بلند و بالا ہونا اصل بات تھی۔

ابھی تک کالج کے نصاب تعلیم پر مبنی علم کی سائنٹفک نوعیت کی نشر و اشاعت کو اس ادارے کے اہم پہلو کے طور پر نمایاں کیا گیا ہے، لیکن در حقیقت طلبا کی سیاسی ذہن سازی کے معاملے میں زائد از نصاب سرگرمیوں نے جو یکساں اہمیت کا حامل رول ادا کیا، خواہ یہ مشکل محسوس ہونے والا ہی سہی، اس پر اسکالروں نے غور نہیں کیا۔ اس وقت کی اخباری رپوٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ کالج کے ممتاز طلبا کو نہ صرف امتحان میں اچھی کارگزاری پر بلکہ مضمون نگاری کے مقابلے میں شرکت کرنے پر بھی انعامات اور تمغے عطا کیے جاتے تھے۔ اس طرح کے تقسیم انعامات کے مواقع پر کارروائی کا مشاہدہ اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے شہر کے بڑے بڑے برطانوی عہدیدار موجود ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مضمون نگاری کے مقابلے کا موضوع یہ تھا کہ حکومت کے دو نظاموں "شخصی اور اجتماعی" میں سے کسے ترجیح دی جانی چاہیے۔ ایک طالب علم خواجہ ضیاء الدین نے، جس کے مضمون کو سب سے اچھا قرار دیا گیا تھا، اس نے دونوں قسم کی حکومتوں کا موازنہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایسی حکومت جس میں سارے اختیارات کسی ایک ہاتھ میں دے دیئے جائیں وہ عقل کے پیمانے پر کھری نہیں اتر سکتی۔ اس لیے اس نے حکومت شخصی کو مسترد کر دیا اور اجتماعی حکومت کو قابل ترجیح سمجھا۔[۱۰۶] سیاسی نظام کے بارے میں طلبا کا یہ تجزیہ قدیم بادشاہت کی

ناپسندیدگی اور قدرِ جدید طرز حکومت کی بالواسطہ حمایت تھی۔ کالج میں طلبا کی اس طرح کی سوچ کو موہن لال، رام چندر، پیارے لال آشوب(۱۰۷)، نذیر احمد(۱۰۸)، ذکاءاللہ(۱۰۹) اور دہلی کالج کے اکثر فارغ التحصیل طلبا میں بعد میں نمایاں ہونے والے وفادارانہ رجحانات کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔

انگریزی تعلیم کا تخالف:

کالج کی پہلی پیڑھی کے طلبا کو اپنی اپنی قوم کے لوگوں کی جانب سے سماجی مقاطعہ کا سامنا کرنا پڑا جس کا چند طلبا نے اپنے طور پر مقابلہ کیا۔ لیکن ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اس مقاطعے کی تاب نہ لا کر جھک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ طلبا کے مقابلے مد نظر تخالف نے مفاہمت کے رویہ کو راہ دی۔ اس طرح دونوں رویوں کے بیچ مجادلہ بھی ہوا اور مفاہمت بھی ہوئی۔ ان طالب علموں میں سے ایک طالب علم شہامت علی نے اپنی اور اپنے دیگر ہم جماعتوں کی داستان بیان کی ہے۔

مولویوں نے یا تو حسد کی بنا پر یا از حد تعصب کی وجہ سے یہ اعلان کیا کہ انگریزی تعلیم کی تحصیل کی ابتدا کر کے ہم نے اپنے دین کو کھو دیا ہے۔ اور تمام مسلمانوں نے ہمیں بے دین سمجھ لیا ہے اور ہمارے ساتھ کھانے پینے سے احتراز کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہادی حسین، میں بذات خود اور ایک یا دو اور دوسرے طالب علموں کے علاوہ مسلم لڑکے انگریزی تعلیم کو ترک کر کے فارسی اسکولوں میں واپس ہو گئے اور فوراً اپنے مذہب کے لوگوں میں شامل کر لیے گئے، جب کہ (۔۔۔) ہم مسلسل کافر سمجھے جاتے رہے۔ آخر کار ایک دن مسٹر ٹریولین نے مولویوں سے مسلم طلبا کو اس کے مذہب سے خارج کیے جانے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے اس کا کوئی مناسب سبب نہیں بیان کیا اور یہ اقرار کیا کہ مذہب اسلام انگریزی تعلیم کے حصول سے منع نہیں کرتا، جس پر مسٹر ٹریولین نے مشورہ دیا کہ ہمیں بھی دوبارہ مذہب اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ اس پر وہ لوگ بغیر کسی اعتراض کے راضی ہو گئے اور ہم مولویوں کے توہم پرستانہ اور خود ساختہ خیال میں دوبارہ مسلمان ہو گئے۔(۱۱۰)

مائکل ایچ۔ فشر کہتے ہیں کہ ' اس پہلی انگریزی کلاس میں موہن لال اور تین دوسرے ہندو طلبا کو بھی اسی طرح کے سماجی دبائو کا سامنا کرنا پڑا۔(۱۱۱) یہاں تک کہ دو دہائی گزر جانے کے بعد بھی بڑی حد تک وہی حالت بر قرار رہی۔ نذیر احمد نے اس کی تائید کی ہے۔ انہوں نے کالج میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر انگریزی کے بجائے اُردو اور خصوصی مطالعہ کے مضمون کے طور پر عربی کو اختیار

کیا۔ چند عوامل میں سے ایک جو انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر منتخب کرنے سے مانع آیا وہ مسلم معاشرے میں اس زبان کے خلاف پھیلا ہوا زبردست تعصب تھا۔ بہر حال ٹیلر کے ترغیب دلانے پر نذیر احمد انگریزی سیکھنے کی طرف مائل ہوئے۔(۱۱۲) اس صورت حال کا نذیر احمد کے ایک شعر میں بہت مناسب اظہار ہوا ہے۔

نام انگریزی کے پڑھنے کا اگر لیتا کوئی
مولوی دیتے تھے فتویٰ کفر کا الحاد کا(۱۱۳)

اپنے مشہور و معروف ناول ابن الوقت کے ابتدائی پیرا گراف میں بھی انھوں نے اس رویے کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس ناول کے ہیرو ابن الوقت نے ایسے وقت میں انگریزی اختیار کی جبکہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔ ' کالج میں کس حد تک تعصب پھیلا ہوا تھا اور اس وجہ سے وہاں انگریزی تعلیم کے خلاف کیسا ماحول تھا اس کا احساس نذیر احمد یوں دلاتے ہیں:

> "دہلی کالج ان دنوں بڑے زوروں پر تھا۔(۔۔۔)لاٹ آئے اور تمام درس گاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے۔ (۔۔۔) جس جماعت میں جاتے مدرس سے ہاتھ ملاتے۔ بڑے مولوی صاحب نے طوعاً کرہاًبادل ناخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی مگر اس ہاتھ کو عضوِ نجس کی طرح الگ تھلگ لیے رہے۔ لاٹ صاحب کا منھ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ (انگریزی صابون سے نہیں بلکہ) مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھو ڈالا۔(۔۔۔) خال خال اور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اکا دکا دہلی کالج میں انگریزی پڑھتے تھے۔ ان لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں آ نکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے تڑواڈالتے۔ ہر چند تعصبات لغو کی کوئی حد نہ تھی۔"(۱۱۴)

انگریزی تعلیمی ادارے کو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جہالت کا گڑھ خیال کرتی تھی۔ مولوی حضرات ان اداروں کے اساتذہ کو جاہل اور ان کے ذریعہ دی گئی تعلیم کو گناہ اور بدعت سمجھتے تھے ۔ اس طرح کی تعلیم کے تعلق سے ایک منفی رویہ یہ تھا کہ یہ تعلیم صرف سرکاری نوکریوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔(۱۱۵)

اس وجہ سے کہ کالج نے ایک نو آبادیاتی جدت پسند کردار اختیار کر لیا تھا اور شہر کے باشندوں کی روزمرہ کی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا تھا، یہ ادارہ اور اس نے جو جدید سائنٹفک اور سیاسی تعلیم دی، خواہ وہ نصاب کا حصہ ہو یا زائد از نصاب ہو، دونوں میں زبردست شک آ گیا اور بعد میں نو آبادیاتی جدت کے مخالفین کی پر تشدد مخالفت اور بربادی کا سبب بنے۔ اسی لیے دہلی میں بغاوت پھوٹنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد باغیوں نے کالج کو منہدم کر دیا، انگریزی کتابوں کو تہس نہس کر دیا اور دیگر کتابیں لوٹ لیں اور وہاں نصب بڑے ٹیلی اسکوپ کو بری طرح توڑ ڈالا اور اس کے پرنسپل ٹیلر، ہیڈ ماسٹر رابرٹ، ان کی دو لڑکیوں، سکینڈ ماسٹر اسٹوارٹ اور پانچ عیسائی طلبا کو قتل کر دیا۔(۱۱۶) انھوں نے ہر اس چیز کے ساتھ تشدد روا رکھا جو سامراجیت کی نشانی تھی یا جسے اس کا نمائندہ یا ذریعہ سمجھا جا رہا تھا۔ انھوں نے موہن لال اور رام چندر کا بڑی شدت کے ساتھ تعاقب کیا۔ موہن لال نے کمال ہوشیاری اور دانشمندی سے اپنے اوپر ہونے والے کئی ایک جان لیوا حملوں سے خود کو محفوظ رکھا لیکن آر۔ ہاجیز (R. Hodges) جن کی بیوی اپنی 'سوتیلی مسلم ماں' کی لڑکی تھی، اس معاملہ میں بد نصیب ٹھہرے اور جب وہ بھیس بدل کر شہر چھوڑنے کے فراق میں تھے مارے گئے۔(۱۱۷) رام چندر کی جان بھی بغاوت کے دنوں میں بڑے خطرہ میں تھی۔ وہ بھی ڈاکٹر چمن لال کی طرح بغاوت کے پہلے ہی دن مارے جاتے مگر وہ اپنی جان بچاتے پھرے اور کسی طرح محفوظ رہے۔(۱۱۸) ڈاکٹر چمن لال اور رام چندر کا بپتسمہ کرنے والے دہلی کے گرجا میں متعین پادری M. J. Jennings کو باغیوں نے قتل کر دیا اور اپنی دانست میں سمجھا کہ انھوں نے اس سے بدلہ لے لیا۔

دہلی کالج میں جو دوربین لگائی گئی تھی اس کی بغاوت کے دوران میں تباہی سے نذیر احمد کافی دل برداشتہ ہوئے۔ انھوں نے اس واقعہ پر سب سے زیادہ تاسف کیا۔ ان کا خیال تھا کہ "دین، دین" کا نعرہ بلند کرنے والے ناعاقبت اندیش باغی سپاہیوں کے ہاتھوں اس کی توڑ پھوڑ ملک کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔(۱۱۹) یہ باغی سپاہی ان لوگوں میں شامل تھے جو ہر اس چیز سے متنفر تھے جو جدید ہو یا اس پر برطانوی مہر لگی ہوئی ہو۔ ان کے گھروں میں کھانے پکانے کے لیے تانبے کے کچھ برتن، نماز پڑھنے کے لیے ایک بوریا اور وضو کرنے کے لیے ایک بدھنا ہوتا تھا۔(۱۲۰) یہ ان کی کائنات تھی۔ یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ ملک کے عام باشندوں میں انگریزی تعلیم کے تئیں جو حقارت تھی اس میں بغاوت عظیم کی تقریباً تین دہائیوں کے اندر کمی محسوس کی جا رہی

تھی۔ لیکن نذیر احمد کو اس امر کا بھی احساس تھا کہ مسلمان احمقانہ تعصب کی بنا پر انگریزی تعلیم سے بے پروائی برتتے تھے اور بدلتی ہوئی صورت حال کے ہم قدم نہیں تھے۔ اس کے باوجود انھیں یقین تھا یہ ماحول تبدیل ہوگا اور لوگوں کی اس ذہنیت میں تغیر ہوگا۔(۱۲۱) انھوں کی اپنی امید کی شمع کو روشن رکھا۔

ماحصل

انگلیسیتی اور مستشرقی دونوں نسخے ہندستان میں حکومت سازی کے تعلیمی و تہذیبی تصورات کے مجموعے تھے۔ ان دونوں کا مقصد ہندستان میں نوآبادیاتی حکومت کے قیام کو حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ انگلیسیتی کا منشا تھا کہ ہندستانی رعایا انگریزی تعلیم، برطانوی تہذیب و تمدن، عیسائیت اور نوآبادیاتی حکومت کی برتری کو محسوس کریں اور تسلیم کریں جبکہ مستشرقی کا مقصد ہندستانیوں کی تہذیب، ان کے مذاہب اور روایات کی تعریف و توصیف کر کے، ان کو علمی اور ادارہ جاتی شکل عطا کر کے اور ان کو ہر طرح سے فروغ دے کر رعایا کی خاموش رضامندی کا حصول تھا۔ دونوں نسخوں کی خصوصیات میں اشتراک کا پہلو برطانوی نوآبادیاتی حکومت کو استحکام عطا کرنے اور تہذیب اور تعلیم کے ذرائع سے صدیوں تک اس کو دوام بخشنے کا مشترک سامراجی عزم تھا۔ جدید ادارے کے فارغ التحصیل طلبا کی سیاسی آئیڈیالوجی، مذہبی میلان، پیشے کے انتخاب اور معاشرتی زندگی کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انگلیسیتی تہذیبی و تعلیمی حکمت عملی بڑی حد تک کارگر اور درست ثابت ہوئی۔ جدید تعلیم یافتہ یا ملازمت پیشہ طبقہ یا برطانوی نظام حکومت سے فیضیاب لوگ مجموعی اعتبار سے ۱۸۵۷ کی عظیم بغاوت کے دوران میں انگریزوں کی حمایت کرنے پر آمادہ تھے۔ اس کے برعکس مستشرقی تہذیبی و تعلیمی اسکیم ہندستان میں حکومت سازی کے لیے عموماً بے معنی اور غیر متوافق ثابت ہوئی۔ اس کا بہترین مظاہرہ اسی بغاوت عظیم کے دنوں میں ہوا جب ناخواندہ اور روایت پسند قوتیں برطانوی اقتدار، ان کی تہذیبی برتری اور ان تمام چیزوں کے خلاف بڑے جوش و خروش کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں جو نوآبادیاتی جدت کی علامت سمجھی جارہی تھیں۔

در حقیقت انگریزی تعلیم کے اس ادارے کو لوگوں کی بہت بڑی تعداد جدید اقدار اور تہذیب کی نشر و اشاعت کا ایک اہم آلۂ کار خیال کرتے تھے۔ اس کا اظہار روایت پسندوں کے معاندانہ رویے سے ہوا اور بغاوت عظیم کے زمانے میں باغی قوتوں کی حرکات کی صورت میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ تاہم اس انگلیسیتی نسخے کا اہم ترین پہلو روایت پرستی، مذہبی قدامت پسندی اور توہم

پرست ذہنیت میں اس کی اثر پذیری اور جدید کشادہ ذہن انسان کی تشکیل تھا۔ جدید سائنس کی حیرت انگیز بالکل اَن دیکھی دنیا کی سیر کرا کے آزاد کوش اور عقلیت پسند نو آبادیاتی مہم نے خواہ اپنے طریقے اور اپنے سامراجی مقصد ہی سے سہی طلبہ کے لیے نئے آفاق وا کر دیئے۔

پروفیسر مظہر مہدی 'جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سے وابستہ ہیں۔

حوالے اور حواشی

1. "Extract from C. Grant's Observations on the State of Society among the Asiatic subjects of Great Britain, particularly with respect to morals; and on the means of improving it. Written chiefly in the year 1792: dated August 16, 1797" in H. Sharp (ed.), Selections from Educational Records, Part I: 1781-1839, Calcutta; Superintendent Government Printing, 1920 [SER, I], pp. 81-86; Ainslie Thomas Embree, Charles Grant and British Rule in India, London: George Allen & Unwin Ltd., 1962, chapter VII; Penelope Carson, "Charles Grant," in H.C.G. Matthew and Brian Harrison (eds.), Oxford Dictionary of National Biography, Vol. 23, Oxford: Oxford University Press, 2004, pp. 290-293.
2. "Extract from the Proceedings of the Resident at Benares dated 1st December 1791", Bengal Past and Present, Vol. 8, Nos. 15-16 (January-June 1914), pp. 133-137. Vasudha Dalmia, "Sanskrit Scholars and Pandits of the Old School: the Benares Sanskrit College and the Constitution of Authority in the late Nineteenth Century" in her Orienting India: European Knowledge Formation in the Eighteenth and Nineteenth Centuries, New Delhi: Three Essays Collective, 2003, pp. 29-52; V.A. Narain, Jonathan Duncan and Varanasi, Calcutta: Firma K.L. Mukhopadhyay, 1959, pp. 170-73; Pamela Nightingale, "Jonathan Duncan" in H.C.G. Matthew and Brian

Harrison (eds.), Oxford Dictionary of National Biography, Vol. 17, Oxford: Oxford University Press, 2004, pp. 242-244.

3. Minute by Lord Minto, March 6, 1811, Appendix (I), Appendix to the Report from Select Committee on the Affairs of the East India Company, (I.-Public.), Minutes of Evidence taken before the Select Committee on the Affairs of the East India Company, No. 735-I, [Reports from Committees: eighteen volumes,] Session 6 December 1831-16 August 1832, VOL. 1X, 1831-32 [Minutes of Evidence], pp. 484-486. British Library, London [BL].

4. Extract from a minute by Lord Moira, on the Judicial administration of the Presidency of Fort William, dated the 2nd October 1815, SER, I, pp. 24-29.

5. SER, I, p. 17.

6. R. Coupland, Wilberforce: A Narrative, Oxford: Clarendon Press/New York: Oxford University Press, 1923.

7. The Parliamentary Debates, Vol. XXVI, London: T. C. Hansard for Longman [and others], 1813, p. 832.

8. Dhruv Raina and S. Irfan Habib, Domesticating Modern Science: A Social History of Science and Culture in Colonial India, New Delhi: Tulika Books, 2004, p. 13.

9. The Law relating to India, and the East-India Company, fifth edition, London: Wm. H. Allen & Co. 1855, p. 165.

10. SER, I, p. 18.

11. Extract of Letter, in the Public Department, from the Court of Directors to the Governor-General in Council of Bengal; dated 3[r]d June 1814, Appendix (I), Appendix to the Report from

Select Committee on the Affairs of the East India Company, (I.-Public.), Minutes of Evidence, pp. 486-487. BL.

12. MINUTE of Sir Thomas Munro, March 10, 1826, Ibid., p. 506. BL.

13. The Law relating to India, and the East-India Company, p. 165.

14. Minute by the Governor-General, Warren Hastings, dated the 17th April 1781 and Minute, dated the 10th March, 1826, by Sir Thomas Munro, SER, I, pp. 7-10, 73; Bruce Tiebout McCully, English Education and the Origins of Indian Nationalism, New York: Columbia University Press, 1940, pp. 19-20.

15. McCully, English Education and the Origins of Indian Nationalism, p. 20.

۱۶۔ یہ کمیٹی مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی :

J.H. Harington, J.T. Larkins, W.B. Martin, W.B. Bayley, H. Shakespeare, Holt Mackenzie, Henry Prinsep, A. Sterling, J.C.C. Sutherland, and H. H. Wilson. Minutes of Evidence, VOL. 1X, 1831-32, p. 408. BL.

17. Bentinck's minute on European settlement, 30 May 1829, in C. H. Philips (ed.), The Correspondence of Lord William Cavendish Bentinck, Vol. I: 1828-1831, Oxford: Oxford University Press, 1971, [CCB, I] pp. 201.

18. McCully, English Education and the Origins of Indian Nationalism, p. 66.

19. C. E. Trevelyan to Bentinck, dated Calcutta, 9 April 1834, in C. H. Philips (ed.), The Correspondence of Lord William Cavendish Bentinck, Vol. II: 1832-1835, Oxford: Oxford University Press, 1971 [CCB, II], pp. 1238.

20. Ibid.

21. McCully, English Education and the Origins of Indian Nationalism, pp. 66-67.

22. T. B. Macaulay's minute on education, 2 February 1835, CCB, II, pp. 1403-1413.

23. Draft on educational policy [February 1835], CCB, II, pp. 1413-1414; McCully, English Education and the Origins of Indian Nationalism, p. 66.

24. H. H. Wilson, the Secretary to the Committee of Public Instruction, to local Agents, dated Calcutta, September 1823, Proceedings relating to the public education of the natives and to the Institutions for its promotion. IOR/F/4/909. BL.

25. Margrit Pernau, "Middle Class and Secularization: The Muslims of Delhi in the Nineteenth Century", in Imtiaz Ahmad and Helmut Reifeld (eds.), Middle Class Values in India and West Europe, New Delhi: Social Science Press, 2001, pp. 21-41.

26. J.H. Taylor, Secretary to the Delhi Local Agency, to H.H. Wilson Secretary and Junior Member of the Committee of Public Instruction, Fort William, dated Delhi Local Agency Office, the 17th January 1824, Proceedings relating to the public education of the natives and to the Institutions for its promotion. IOR/F/4/909. BL.

27. Minutes of Evidence, VOL. 1X, 1831-32, pp. 408-409. BL.

28. Ibid.

29. Statement of all the Public and Private Schools and Colleges in the City of Dehli with particulars of their means of support.

Prepared by J.H. Taylor, Secretary to the Agency Delhi Territory, the 8th January 1824, Proceedings relating to the public education of the natives and to the Institutions for its promotion. IOR/F/4/909. BL.

30. Minutes of Evidence, p. 435, BL. See also: S. C. Sanial, 'The 'Itimad-ud-Daulah Institution at Delhi', Islamic Culture, Vol. IV, [No. 2], April 1930, pp. 311-313;

سید کمال الدین حیدر، سوانح سلاطین اودھ، جلد اول، کانپور: نول کشور، ۱۹۰۷، ص ص، ۲۹۱، ۲۹۴-۲۹۵، ؛عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۵، ص ص، ۸-۱۰۔

31. Court of directors to the Bengal government on the education of Indians, dated 29 September 1830, CCB, II, p. 521.

32. Michael H. Fisher, 'Mohan Lal Kashmiri (1812-77): An Initial Student of Delhi English College', in Margrit Pernau, (ed.), The Delhi College: Traditional Elites, the Colonial State, and Education before 1857, New Delhi: Oxford University Press, 2006, p. 236.

۳۳۔ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص، ۷، ۱۱، ۲۸۔

34. Court of directors to the Bengal government on the education of Indians, dated 29 September 1830, CCB, II, p. 519.

۳۵۔ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص، ۲۸۔

36. C. E. Trevelyan to Bentinck, dated Calcutta, 9 April 1834, CCB, II, pp. 1238.

37. Introduction by Pernau, The Delhi College, p. 14.

۳۸۔ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص، ۹۶-۹۷۔

39. Extracts from Mr. Thomason's minutes dated the 8th April 1841 and the 8th November 1841, Selections from Educational Records, Part II: 1840-1859, J. A. Richey (ed.), Calcutta:

Superintendent Government Printing, 1922 [SER, II], pp. 253, 254.

40. [Report of proceedings for the year 1838/39 by] Members of the General Committee of Public Instruction to the Right Honble George Earl of Auckland, Governor General of India in Council, dated Fort William, the 24th May 1840/8th July 1840, Proceeding No. 26, Letter No. 529. Home Public Proceedings July-September 1840. National Archives of India, New Delhi [NAI].

41. General Committee on Public Instruction to Governor General in Council, George Earl of Auckland, dated Fort William, 30th October 1840, No. 1035. Home Consultation A (Public) 16 December 1840, No. 24. NAI.

42. Ibid.

43. Extracts from Thomason's minutes of various dates, in SER, II, pp. 252-254.

44. General Committee on Public Instruction to Governor General in Council, George Earl of Auckland, dated Fort William, 30th October 1840, No. 1035. Home Consultation A (Public) 16 December 1840, No. 24. NAI.

45. General Report on Public Instruction, in the North Western Provinces, of the Bengal Presidency. For 1844-45. Agra: The Secundra Orphan Press, 1846, p. 1. [Microfilm V/24/905.] BL.

۴۶۔ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص،۳۶-۳۷۔

47. Minute By Boutros. General Report on Public Instruction in the North Western Provinces of the Bengal Presidency, for

1843-44, Agra: The Agra Ukhbar Press, [n.d], Appendix N. [microfilm V/24/905.] BL.

48. J. Thornton, Secretary to the Government of N.W.P, to F. Boutros, Secretary to the Local Committee of Education at Delhi, and Principal of the Delhie College, letter No. 336, dated Agra, the 13th April, 1844, General Report on Public Instruction in the North Western Provinces of the Bengal Presidency, for 1843-44, Agra: The Agra Ukhbar Press, [n.d.], Appendix R. [microfilm V/24/905.] BL.

49. Introduction by Pernau, The Delhi College, p. 18.

50. A. Sterling, Acting Deputy Persian Secretary to Government, to [the members of Committee of Public Instruction], dated Fort William, 31st July 1823, Proceedings relating to the public education of the natives and to the Institutions for its promotion. IOR/F/4/909. BL.

51. Letter, dated 6th October 1823, from the General Committee of Public Instruction, SER, I, p. 88.

۵۲۔ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص، ۷۳-۹۴۔

53. F. Boutros, An Inquiry into the System of Education Most likely to be generally Popular and Beneficial in Behar and Upper Provinces, [Serampore?]: Serampore Press, 1842, p. 29.

54. Edwin Jacob, A Memoir of Professor Yesudas Ramchandra of Delhi, Vol. I, Cawnpore: Christ Church Mission Press, 1902, p. 11.

۵۵۔ بوتروس کا خط گارساں دتاسی کے نام، دہلی ۱۹/ دسمبر ۱۸۴۱، جو جرنل ایشیاٹک (فروری ۱۸۴۲)، سے اردو میں ترجمہ کر کے عبدالحق نے اپنی کتاب، مرحوم دہلی کالج، کے صفحہ اسے پہلے اور فہرست کے بعد شائع کیا۔

56. F. Boutros, An Inquiry into the System of Education Most likely to be generally Popular and Beneficial in Behar and Upper Provinces, p. 20 n.

57. Ibid., p. 15.

۵۸۔ مالک رام، قدیم دلی کالج، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵، ص ص، ۳۲-۳۳؛ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص، ۱۳۴-۱۳۷، ۱۴۳۔

59. Introduction by Pernau, The Delhi College, p.18.

۶۰۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، دہلی: سید الاخبار پریس، ۱۸۴۶۔

۶۱۔ عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص،۱۳۸-۱۳۹۔ حاشیہ نمبر ا۔

۶۲۔ کتابوں کی فہرست کے لیے دیکھئے: عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص،۱۴۹-۱۵۵، اور مالک رام، قدیم دلی کالج، "ضمیمہ"، ص ص، ۶۴-۷۸۔

63. Hari Ram Gupta, Life and Work of Mohan Lal Kashmiri 1812-1877, Lahore: Minerva Book Shop, 1943, p. 7 fn 1, 8, fn 3; C.A. Bayly, Empire and Information: Intelligence gathering and social communication in India, 1780-1870, Cambridge: Cambridge University Press, 1996, pp. 230-34.

64. Michael H. Fisher, "Mohan Lal Kashmiri (1812-77): An Initial Student of Delhi English College," in Pernau, The Delhi College, pp. 232-260; Bayly, Empire and Information, pp. 233-34.

65. K. Sajun Lal, 'Professor Ramchandar as an Urdu Journalist', Islamic Culture, Vol. XXIII, No. 1 & 2, p. 25, January & April 1949.

تعلیم نسواں کی حمایت میں رام چندر کا لیکچر دیکھئے، رسالۂ دہلی سوسائٹی، نمبر۔ ۲(۱۸۶۶)، ص، ۷۴-۸۰۔

۶۶۔ سائنس پر رام چندر کی مقبول عام تحریروں اور نیز ان کی کتابوں اور ترجموں کی فہرست کے لیے دیکھئے:

Raina and Habib, Domesticating Modern Science, pp. 16-19, 23, note 52.

67. A Treatise on Problems of Maxima and Minima, Solved by Algebra, London: WM. H. Allen & Co., 1859.

68. Edwin Jacob, A Memoir of Professor Yesudas Ramchandra of Delhi, Vol. I, Cawnpore: Christ Church Mission Press, 1902, pp. 145-149; A. De Morgan, "Editor's Preface" in A Treatise on Problems of Maxima and Minima, Solved by Algebra, Ramchundra, London: WM. H. Allen & Co., 1859, pp. iii-xxiii;

سیدہ جعفر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، حیدرآباد: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۶۰، ص ص، ۱-۹۰؛ صدیق الرحمن قدوائی، ماسٹر رام چندر، دہلی: شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱۔

69. Arthur Howell, Offg. Secretary to the Government of India, to Munshi Ram Chundra, Nos. 97-122, dated Fort William, the 12th April 1876, Prog. No. 23. Home Department Proceedings, Education, April 1876. [NAI.]

۷۰۔ رسالۂ دہلی سوسائٹی، نمبر۔ ۲(۱۸۶۶)، ص، ۲۵۔ مزید دیکھئے، امداد صابری، حیات آشوب، دہلی: یونین پریس، ۱۹۵۷، ص،۷۵۔

۷۱۔ صابری، حیات آشوب، ص ص، ۸۳-۹۰؛ برج موہن دتاتریہ کیفی، "ماسٹر پیارے لال آشوب"، دلی کالج اردو میگزین، قدیم دلی کالج نمبر، جلد ۴، شمارہ نمبر ۱ (۱۹۵۳)، ص،۲۹۔

۷۲۔ پیارے لال، "علمی ضمیمہ"، زمانہ، مارچ ۱۹۱۱، ص ص، ۲۲۹-۲۳۱؛ محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنّفین، دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۲۸، ۱۶۱-۱۶۲حواشی؛ صابری، حیات آشوب، ص، ۱۳۲۔۱۳۴، ۱۶۰

W.R.M. Holroyd, Report on Popular Education in the Panjab and its Dependencies, for the year 1873-74, Lahore: W.E. Ball, 1874, p. 111.

73. Kavita A. Sharma and W. D. Mathur, Hindu College Delhi: A People's Movement, New Delhi: Niyogi Books, 2014, p. 61.

۷۴۔ صابری، حیات آشوب، ص،۱۳۶۔

75. C. F. Andrews, Zaka Ullah of Delhi, New Delhi: Oxford University Press, 2003, p. 60.

76. S. Irfan Habib, "Munshi Zakaullah and the Vernacularisation of Science in Nineteenth Century India" in Uncharted Terrain: Essays on Science Popularisation in Pre-Independence India, Narendra K. Sehgal, Satpal Sangwan and Subodh Mahanti, (eds.) New Delhi: Vigyan Prasar, 2000, pp. 140-41.

77. The Aligarh Institute Gazette, 8 March 1887, p. 271.

78. Amaranatha Jha. A History of the Muir Central College, 1872-1922. Allahabad: Allahabad University, 1938, p. 382.

79. Act XVIII of 1887, Appendix M. Government of India. Proceedings of the Legislative Department for October 1887. No. 43. Allahabad University Act, 1887. NAI.

80. The Aligarh Institute Gazette, 12 July 1887, pp. 771-772; Shan Muhammad, Sir Syed Ahmad Khan: A Political Biography, Meerut; Meenakshi Prakashan, 1969, p. 98; Javed Ali Khan, Early Urdu Historiography, Patna: Khuda Bakhsh Oriental Public Library, [2005], pp.198, 200.

81. Appendix, III, Art XIII, in Mushirul Hasan, A Moral Reckoning: Muslim Intellectuals in Nineteenth-century Delhi, reprint, New Delhi: Oxford University Press, 2007, pp. 266-67; The Aligarh Institute Gazette, 8 March 1887, pp. 271-72.

82. Javed Ali Khan, Early Urdu Historiography, p.198;

قدیر احمد، ”شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ خان“، دلی کالج اردو میگزین، قدیم دلی کالج نمبر، جلد ۴، شمارہ ۱(۱۹۵۳)، ص،۱۴۹۔

83. Manual of Titles, North-Western Provinces, Allahabad: North-Western Provinces and Oudh Government Press, 1889, p. 125; The Aligarh Institute Gazette, 8 March 1887, p. 271.

۸۴۔ افتخار احمد صدیقی، مولوی نذیر احمد دہلوی: احوال و آثار، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱، ص، ۳۵،۳۷،۴۱،۴۸۔

85. Ralph Russell, The Pursuit of Urdu Literature: A Select History, London and New Jersey: Zed Books, 1992, p. 118.

۸۶۔ نذیر احمد، درباری لیکچر، دہلی: مطبع صدیقی، [۱۹۰۳]، ص ص، ۱۵، ۲۱-۲۲؛ افتخار عالم بلگرامی، حیات النذیر، دہلی: شمسی پریس، ۱۹۱۲، ص ص، ۳۹، ۵۶-۶۱۔

87. C. M. Naim, "William Muir & M. Kempson," in The Repentance of Nussooh, M. Kempson, Tr. C. M. Naim, Ed. New Delhi: Permanent Black, 2004, p. 114;

بلگرامی، حیات النذیر، ص، ۵۷۳؛ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، (مرتبہ) رشید حسن خاں، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۲، ص، ۶۵۔

88. Jacob, A Memoir of Professor Yesudas Ramchandra of Delhi, pp. 71-72.

89. Andrews, Zaka Ullah of Delhi, pp. 59-60.

90. Ibid.

91. Ibid., p. 46.

۹۲۔ نذیر احمد، موعظہ حسنہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳، ص ص، ۲۰۳-۲۰۴۔

۹۳۔ نذیر احمد، اجتہاد، دہلی: افضل المطابع، ۱۹۰۸، ص، ۱۸۰۔

94. Andrews, Zaka Ullah of Delhi, pp. 107-108;

عنایت اللہ دہلوی، نقوش، آپ بیتی نمبر (حصہ دوم)، ۱۰۰، (جون ۱۹۶۴)، ص، ۱۴۰۳۔

95. Michael H. Fisher, "Mohan Lal Kashmiri (1812-77): An Initial Student of Delhi English College," in Pernau, (ed.), The Delhi College, p. 252;

پیارے لال، ”در باب راہ و رسم صاحبان انگریزی و ہندستانی“، صابری، حیات آشوب، ص، ۱۶۹۔ یہی مضمون ۲۲/ مئی ۱۸۶۶ء دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا، رسالۂ دہلی سوسائٹی، نمبر ۲ (۱۸۶۶ء)، ص ص، ۲۳-۲۵۔

۹۶۔ نذیر احمد، لیکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، آگرہ: مفید عام پریس، ۱۹۱۸، ص ص، ۴۰۲-۴۰۳۔

۹۷۔ نذیر احمد، لیکچر۔۔۔ مسلمانوں کی حالت تعلیم پر، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، لاہور، ۲۸/ دسمبر ۱۸۸۸ء، آگرہ: مفید عام پریس، ۱۸۸۹، ص ص، ۱۱-۱۳۔

۹۸۔ ایضاً، ص، ۱۱-۱۲۔ انھوں نے اپنے ناول ابن الوقت میں بھی بہت ہی واضح طور پر اپنے اس موقف کا اظہار کیا۔ ”یورپ کی تمام تر ترقی کا اصلی اور حقیقی سبب علوم جدید ہیں اور اس زمانے میں تعلیم وہی مفید ہو سکتی ہے جس سے یہاں کے لوگ ان علوم سے آگہی بہم پہنچائیں اور ان کی طبیعتوں میں اس بات کا شوق پیدا ہو کہ واقعات کو سوچیں اور موجودات میں غور کریں۔“ نذیر احمد، ابن الوقت، دہلی: مطبع انصاری، ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء، ص، ۸۸۔

۹۹۔ احمد، درباری لیکچر، ص، ۱۱۔

۱۰۰۔ نذیر احمد، ”مسلمانوں کا تنزل اور اس کا اصلی سبب“، معارف، جلد ۳، شمارہ ۲ (اگست ۱۹۰۰ء)، ص، ۴۸-۴۹، نذیر احمد، درباری لیکچر، ص، ۱۴-۱۵۔

101. Quoted by Fisher, "Mohan Lal Kashmiri", in Pernau, The Delhi College, p. 248.

۱۰۲۔ قدوائی، ماسٹر رام چندر، ص ص، ۳۴-۳۵، ۴۴، حاشیہ نمبر ۲، اور ص، ۵۱، حاشیہ نمبر ۱۔

103. A. De Morgan, "Editor's Preface," in A Treatise on Problems of Maxima and Minima, Ramchundra, pp. xxi-xxii; See one of the many unnumbered pages of photographs between pp. 340-341 in P. J. O. Taylor (ed.), A Companion to the 'Indian Mutiny' of 1857, Delhi: Oxford University Press, 1996.

۱۰۴۔ احمد، درباری لیکچر، ص، ۱۴-۱۵، قدوائی، ماسٹر رام چندر، ۱۹۶۱ء، ص، ۳۹-۴۴، ۴۹-۵۰
Habib, "Munshi Zakaullah and the Vernacularisation of Science" in Sehgal et al, (eds.), Uncharted Terrain, p. 140.

۱۰۵۔ صابری، حیات آشوب، ص، ۱۳۹۔

۱۰۶۔ قران السعدین، ۲۳؍ دسمبر ۱۸۵۴، قاسم علی سجن لال، ''قدیم دہلی کالج کے کچھ حالات: ہم عصر اخباروں کی زبانی''، دلی کالج اردو میگزین، (قدیم دلی کالج نمبر)، جلد ۴، شمارہ ۱(۱۹۵۳)، ص،۳۸۔ قاسم علی کا خیال ہے کہ یہ حکومت کا حامی اخبار تھا اور نوجوان پیڑھیوں کے مقاصد کے حصول کی وکالت کرتا تھا۔

K. Sajan Lal, "A Few News-papers of pre-Mutiny Period", Indian Historical Records Commission, Proceedings of Meeting, Nineteenth Meeting held at Trivandrum, Vol. XIX, (December 1942): 128-132. Especially p. 131.

۱۰۷۔ پیارے لال، ''در باب راہ و رسم صاحبان انگریزی و ہندستانی''، صابری، حیات آشوب، ص، ۱۶۹-۱۷۱۔

۱۰۸۔ نذیر احمد، رسالہ چند پند، لکھنو: مطبع منشی نول کشور، ۱۸۸۶، ص، ۴۵، نذیر احمد، ابن الوقت، ص،۴۳،۹۱۔

۱۰۹۔ ذکاء اللہ، تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ہند بعہد شہنشاہی حضرت عالیہ ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر ہند بالقابہا، جلد دوم، دہلی: شمس المطابع، ۱۹۰۴، ص،۳۰۵؛

Andrews, Zaka Ullah of Delhi, p. 31.

110. Shahamat Ali, The Sikhs and Afghans, in connexion with India and Persia, immediately before and After the Death of Ranjeet Singh: from the Journal of an Expedition to Kabul, through the Panjab and the Khaibar Pass, London: John Murray, 1847, pp. viii-ix.

111. Fisher, Mohan Lal, p. 241.

۱۱۲۔ قاری عباس حسین، ''شمس العلما مولوی نذیر احمد''، نقوش، شخصیات نمبر، ۴۷،۴۸ (جنوری ۱۹۵۵ء)، ص، ۵۶۶۔

۱۱۳۔ نذیر احمد، مجموعہ نظم بے نظیر، (مرتبہ) سید افتخار عالم بلگرامی مارہروی، ایٹہ: کاٹن پریس، ۱۹۰۹ء، ص، ۱۱۸۔

۱۱۴۔ نذیر احمد، ابن الوقت، ص، ۲-۳۔

۱۱۵۔ "ترجمۂ حالی"، کلیات نظم حالی، جلد اول، (مرتبہ) افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی اردو، ۱۹۶۸، ص ص، ۵-۷؛ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی: تذکرہ خواجہ الطاف حسین حالی، تیسرا ایڈیشن، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۵، ص، ۲۸۔

۱۱۶۔ فرحت اللہ بیگ، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، ص ص، ۵۳-۵۴، مزید دیکھئے، عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ص، ۶۹-۷۳؛ مالک رام، قدیم دلی کالج، ص ص، ۵۶-۵۷۔

117. Gupta, Life and Work of Mohan Lal Kashmiri, pp. 322- 327.

118. A. De Morgan, "Editor's Preface", in A Treatise on Problems of Maxima and Minima, Ramchundra, pp. xxi-xxii; See one of the many unnumbered pages of photographs between pp. 340-341 in P. J. O. Taylor (ed.), A Companion to the 'Indian Mutiny' of 1857, Delhi: Oxford University Press, 1996.

۱۱۹۔ بیگ، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، ص، ۵۳-۵۴۔

۱۲۰۔ نذیر احمد، مسلمانوں کی حالت تعلیم، ص، ۱۲۔

۱۲۱۔ نذیر احمد، ابن الوقت، ص، ۸۸۔